قاسم خورشید

کینوس پر چہرے

کینوس پر چہرے

(منتخب افسانے)

کینوس پر چہرے

(منتخب افسانے)

قاسم خورشید

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

©جملہ حقوق بہ حق مصنف محفوظ

Canvas per chehre

(Selected Stories)

by

Quasim Khursheed
HOD, SCERT, Bihar
Naugharwa, Sultan Ganj,
Patna-800006 (Bihar), INDIA
Mob. : 09334079876, Email: saeban@sify.com

Year of Ist Edition 2010
ISBN 978-81-8223-737-7
Price Rs. 150/-

نام کتاب	:	کینوس پر چہرے
مصنف	:	قاسم خورشید
تزئین کار	:	شمشیر قمر
اشاعت	:	۲۰۱۰ء
قیمت	:	۱۵۰ روپے
مطبع	:	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ۶

-: ملنے کے پتے :-

☆ بک امپوریم، اردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ
☆ ڈاکٹر قاسم خورشید، صدر شعبہ، ایس سی ای آر ٹی، پٹنہ

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

ابّو

مرحوم غلام ربّانی

کے نام

کینوس پر چہرے
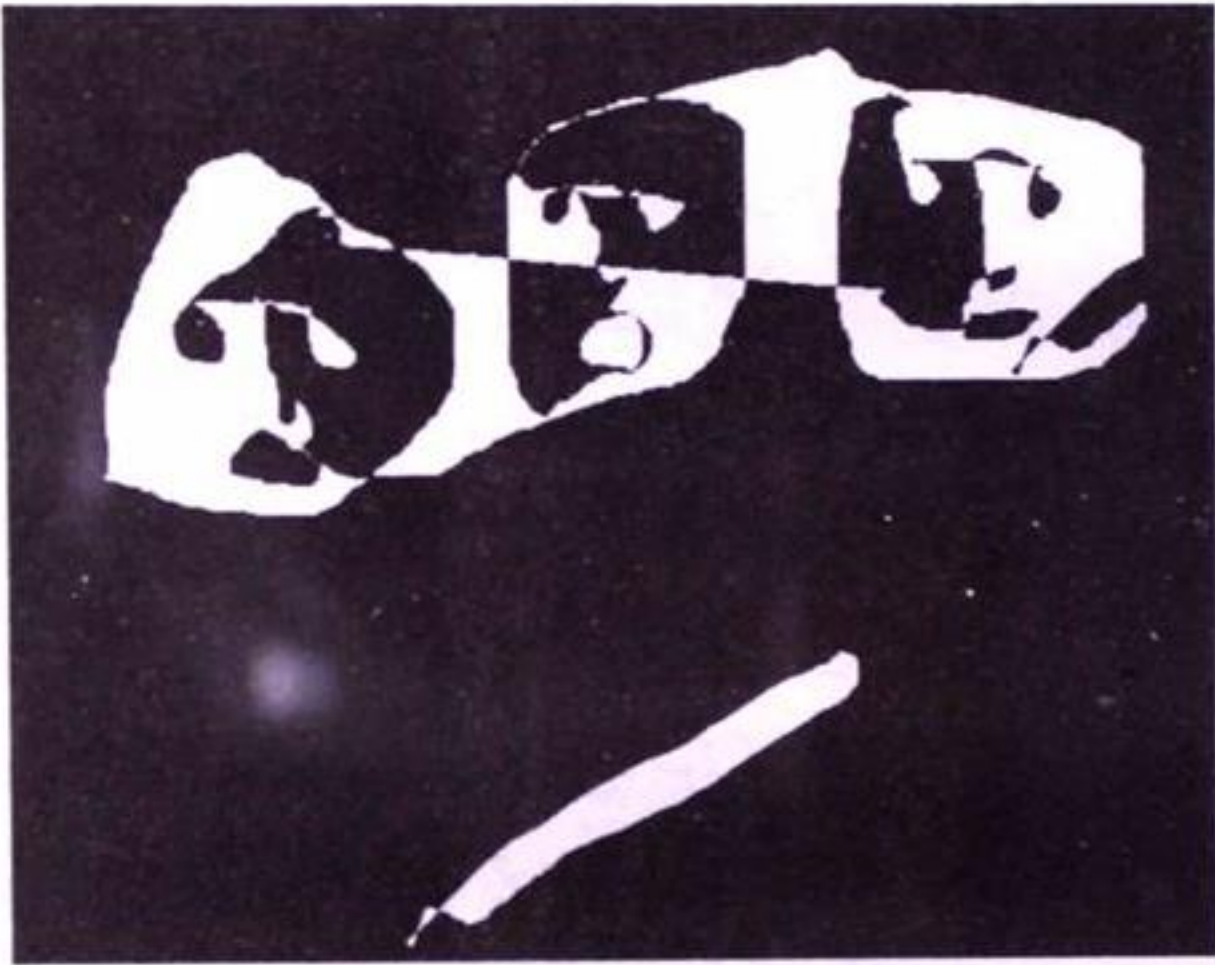
شروع سفر میں لگاتار حادثوں کے حصار میں رہا، سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ بچپن کب شروع ہوتا ہے، سن بلوغیت کی کیا اہمیت ہے یا پھر والدین کے سائے میں کس طرح سکون کا احساس ہوتا ہے۔ دراصل کم عمری میں باپ کی شفقت سے محروم ہونے، زمینداری کے مٹتے ہوئے نقوش کے درمیان شرافت کے لبادے میں اوڑھی ہوئی مفلسی کو دیکھ کر عجیب کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔ ہوا تیز تھی اور چراغوں کو بھی روشن رہنا تھا۔ زمین اور آسمان کے درمیان سوالوں کا لامتناہی سلسلہ تھا۔ بار بار حضرت ابراہیمؑ کی اس روایت پر ایمان لانے کی خواہش ہوئی کہ جب آسمان کی طرف نگاہ اٹھتی، سورج کو پہلی بار دیکھتا، اور اس کی روشنی سے سارے عالم کو منور ہوتا ہوا محسوس

کرتا تو اُسے اپنا خدا مان لینے کی خواہش ہوتی۔ مگر یہ سلسلہ بھی دن کی روایت کے ساتھ ختم ہو جاتا۔ مایوسی، ڈوبتے ہوئے سورج اور گہری ہوتی ہوئی شام کے سائے میں ایک بار پھر ابھرتی اور چند لمحوں بعد پھر میں آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں کو دیکھ کر اپنے خدا کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتا۔ مگر یہ کیا! کہ لگا تار تیرہ دنوں کی تگ و دو کے بعد آسمان پر مکمل چاند نمودار ہو گیا، تو پھر اس میں ہی اپنے خالق کو، اپنے رہنما کو تلاش کرنے لگا۔

مجھے یاد ہے کہ جب میرے والد کو قبر میں اُتار کر آخری دیدار کے لیے لوگوں کو بلایا گیا تھا تو کسی نے مجھے بھی گود میں اٹھا کر ان کا دیدار کروایا تھا۔ اس وقت قبر میں اُتارنے والے شخص نے مجھ سے یہ کہا تھا: ''دیکھ لو بابو! اب تمھارے ابّو کبھی نہیں آئیں گے''۔ میری سمجھ میں اس وقت یہ بات نہیں آئی تھی اس لیے فرمانبردار بچے کی طرح حامی میں سر ہلا دیا تھا۔ مگر جب واقعی ابّو کئی مہینوں تک نہیں لوٹے اور شامِ غریباں طویل ہوتی رہی، ایسے میں لوگ غم سے نڈھال ہو کر سو جاتے۔ ایسے میں ایک روز میں چپکے سے آنگن کی چھت کے نیچے اُولتی کی اُوٹ میں چھپ کر دیر تک آسمان کو دیکھتا رہا۔ پھر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میرا بچپن آسمان سے مخاطب ہو کر گڑگڑاتے ہوئے کہنے لگا: ''اے اللہ! مجھے معلوم ہے، تُو آسمان پر رہتا ہے، میرے ابّو کو تو نے بلا لیا ہے۔ میرے گھر کے سب لوگ بہت غمگین ہیں، تُو انھیں بھیج دے۔ میری دعا سن لے۔''
اور جب یہ دعا قبول نہیں ہوئی تو ایک روز پھر میں نے آسمان کے خدا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:
''اگر میرے ابّو کی تمھیں بہت زیادہ ضرورت ہے تو انھیں رکھ لے مگر مجھے جلدی سے بڑا کر دے تا کہ میں ابّو کی طرح سارے گھر کا بوجھ اٹھا سکوں، سب کی آنکھوں میں خوشیاں بھر سکوں۔'' مگر یہ دعا بھی قبول نہیں ہوئی بلکہ اذیتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ بچپن کھو گیا اور ہر لمحہ میلوں تک پھیل گیا۔ وقت کی لمبی اسیری اور پربت کاٹ کر راستے گڑھنے کا عمل شروع ہو گیا۔ حقیقتیں بے اماں ہوتی رہیں۔ سورج، چاند، ستارے ایک ایک کر کے سب میری رہنمائی سے قاصر ہوتے رہے۔ میرا تو حضرت ابراہیمؑ جیسا کوئی رہنما بھی نہیں تھا تو پھر تھک ہار کر اپنے اندر ہی کسی تلاش

میں سرگرداں ہوگیا۔ کہاں شفقتیں، کہاں محبتیں، کہاں کامیابیاں، کہاں خوشیاں، کہاں لوگوں کی توجہ کا مرکز، کہیں کچھ بھی تو نہیں تھا۔ مگر ایک جذبہ بار بار مجھے وسعتیں عطا کر رہا تھا اور وہ تھا تخلیقی کرب کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔ نہ جانے کیا کچھ میرے اندر ایک بیج سے پیڑ اور پھر پیڑ سے تناور درخت بننے کے عمل میں تھا اور اذیتوں کے درمیان ہی شاخیں ہری ہو رہی تھیں بلکہ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ انہیں کے سائے میں میری تخلیقی کائنات بتدریج وجود میں آ رہی تھی۔ میں نقشِ فریادی اور شوخیِ تحریر کے معنیٰ کو سمجھنے کی کوششوں میں مشغول ہو چکا تھا۔ یہ تو عجیب دنیا تھی۔ اسے سمجھنے کے لئے ایک کیا ہزاروں زندگیاں بھی کم تھیں۔ میں نے اپنے جوان باپ کی موت دیکھی تو یہ احساس شدید رہا کہ ہمارے پاس بہر حال طبعی زندگی بہت کم ہے۔ اور جہاں تک روح کا تعلق ہے تو وہ بھی اپنی دسترس میں نہیں۔ مگر جو کچھ بھی ملا ہے، اسے کوئی معنیٰ ضرور عطا کرنا ہے۔ دورانِ سفر میرے ہاتھ میں ایک قلم آیا۔ پھر خود کو لکھ کر حرف حرف آشنا ہونے لگا۔ کبھی اندر کے اداکار نے دنیا کے اسٹیج سے اپنے ناظرین کو متوجہ کیا کبھی پینٹنگ کے ذریعہ اپنے جذبات کی ترجمانی میں لگ گیا تو کبھی خاموش رہ کر خواب بُنتا رہا۔ خیر! مجھے اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ واقعی یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا۔ بلکہ ہم جو راہیں بناتے ہیں اس کے دعویدار بھی لگاتار ہمارا تعاقب کرتے رہتے ہیں۔ کئی بار اپنی بنائی ہوئی زمین پر یزیدی لشکروں کو قبضہ کرتے ہوئے دیکھا۔ ایسا نہیں کہ میں ان سے کمزور تھا مگر اپنی وسعتوں یا نیا آسمان گڑھنے کی وجہ سے ہم نے اپنی زمینوں کو ان کے حوالے کر دیا۔ یوں تو دادی اماں سے سنی ہوئی کہانیوں میں اپنے کرداروں کو شامل کرتا رہا یا پھر ان کہانیوں کی تخلیقیت سے اپنی دنیا روشن کی۔ اور نہ جانے کب؟ شاید اس وقت جب محض اسکول سے فارغ ہوا تھا، میں نے پہلا افسانہ 'روک دو' تخلیق کیا۔ افسانہ شائع ہونے کے بعد جب بے حد پذیرائی ہوئی تو میرے اندر مزید اعتماد پیدا ہوا اور پھر اس کے بعد یہ سلسلہ جاری رہا۔ ہاں، میں نے کبھی فورم کو اتنی زیادہ اہمیت نہیں دی جتنی کہ تخلیقیت کو۔ یہی وجہ تھی کہ متن کے حوالے سے میں جس فارمیٹ میں خود کو ڈھالنے کی کوشش

کرتا، بہ آسانی ڈھل جاتا۔ اسی لئے جہاں افسانے لکھتا رہا وہیں ڈرامے، فیچر اور غزلیں، نظمیں بھی تخلیق کرتا رہا۔ مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ آخر لوگ صنف سے فنکار کا تعین کیوں کرتے ہیں؟ غالب جیسے بڑے شاعر کے نثری کارناموں، یا شیکسپیئر کی نظموں اور ان کے ڈراموں یا پھر احمد ندیم قاسمی اور ایسے ہی دنیا کے بڑے تخلیق کاروں کو کیا کسی ایک صنف میں طبع آزمائی کے لئے جانا پہچانا جاتا ہے؟ اصل میں یہ سوال ان کے لئے زیادہ اہم ہوسکتا ہے جو اپنے متن کو ضرورت کے مطابق مختلف اصناف میں ڈھالنے کے اہل نہیں ہوتے ہیں۔ اس لئے میں خود کو محض افسانہ نگار یا شاعر یا ڈرامہ نگار کہلانے کے لئے تگ و دو کرنے سے قاصر رہا بلکہ اپنے متن یا Content کے حوالے سے ہی لوگوں کی توجہ کا طالب رہا۔ جن کا وژن وسعتوں پر مبنی ہے انہوں نے ہمارے اس جذبے کی بے حد پذیرائی کی بلکہ میرے اعتماد کو اصناف کے حوالے سے بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں خود کو منوالینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا ہے۔ خصوصی طور پر اردو ادب کے لئے یہ مشکل ترین مرحلہ تھا۔ مگر یہاں بھی بہر حال ذہانت کی کمی نہیں رہی ہے اسی لئے میں خاموشی سے جو کچھ بھی لکھتا، ہندو پاک کے بڑے رسائل کے حوالے کر دیا کرتا۔ میرے افسانے سب سے پہلے ہندو پاک کے مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ بعد میں بہار نے مجھے قومی یا بین الاقوامی رسائل کے توسط سے ہی پہچانا۔ ممکن ہے اگر لوگ میری عمر یا ایک معمولی شخص کی سماجی حیثیت سے واقف ہو جاتے تو تخلیقی ادب میں وہ اہمیت نہیں ملتی۔ اس لئے تخلیق کاروں کے لئے سب سے ضروری ہے کہ وہ اپنی تخلیق کو بہت اعتماد کے ساتھ زمانے کے سامنے پیش کریں۔ دنیا کی کوئی بھی بڑی لابی یا ادب کی سیاست انہیں دیر تک نہیں روک سکتی۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ بہت سارے تجربے ہیں، بہت ساری یادیں ہیں۔ شاید انہیں سمیٹ پانا میرے لئے ممکن بھی نہیں کیوں کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ بے ترتیب سوچ سے ابھری ہوئی کائنات ہے۔ ظاہر ہے مجھے بہتوں کا بے لوث پیار بھی ملا۔ پذیرائی بھی ملی اور خاطر خواہ ہمت افزائی بھی۔ میں یہاں یہ ذکر ناگزیر سمجھتا ہوں کہ جب

میں ترقی پسند ادبی تحریک سے فطری طور پر وابستہ ہوا تو ہمارے پیش نظر کارل مارکس، لینن، میکسم گورکی، نکولائی استرووسکی، پریم چند، ابراہیم جلیس، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری اور ایسی ہی بہت ساری محترم شخصیتوں کے فکری اور تخلیقی کارنامے تھے۔ گورکی، نکولائی استرووسکی، پریم چند، سردار جعفری اور فیض کو پڑھنے کے بعد ترقی پسندی کا ایک ایسا چہرہ میرے سامنے تھا جو بہرحال کسی بھی جینوئن اور حساس شخص کو متحرک کرنے کے لئے ناگزیر تھا۔ بس ایک جنون میرے ساتھ ہولیا۔ ساری دنیا کے حالات میرے پیش نظر تھے۔ اب تو ایک خواب تھا، ایک ایسا خواب جہاں واقعی حاشیے پر پڑی ہوئی آبادی، خوش حالی و کامرانی کے پرچم لے کرنئی دنیا کی تعمیر میں جٹی تھی۔ حالانکہ ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستہ ہونے کے باوجود کبھی کمیونسٹ پارٹی کا ممبر نہیں رہا۔ اور یہ میرے لئے ضروری بھی نہیں تھا کیوں کہ ہمارے پاس ہماری زندگی کا سب سے بڑا صحیفہ قرآنی کلمات کی شکل میں موجود تھا۔ دراصل یہ وبا جو پھیلائی گئی تھی کہ مذہب افیون ہے، اس سے دور رہا جائے، تو اس کے پیچھے کچھ مقاصد تھے۔ اور شاید بعض تحریک کے چہرے کے مسخ ہونے کا خطرہ بھی تھا۔ چاہے وہ ترقی پسند تحریک ہی کیوں نہ ہو۔ کیوں کہ یہ تحریک ہمیں جو پیغام دینا چاہ رہی تھی۔ دراصل وہ پیغام تو بہت پہلے قرآن حکیم کے حوالے سے دیا جاچکا ہے۔ اگر کمیونزم مزدوروں کے فلاح کی بات کررہی تھی یا امن کی بات کررہی تھی یا انسانیت کی بقا کی کوشش کررہی تھی یا ایک عالم کو خوشنما دیکھنا چاہتی تھی، تو یہ اور ایسے سارے پیغامات قرآنی صحیفے میں پہلے سے موجود ہی تھے۔ کیا یہ بات نہیں کہی گئی تھی کہ 'مزدوروں کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ان کی مزدوری ادا کردی جائے۔' کیا کمیونزم کبھی اس کی مخالفت کرسکتا تھا؟ دراصل ایسے ہی صحیفوں سے فلسفے مستعار تھے، ان ہی وجوہات کی بناپر اپنے چہرے کو کھوتا ہوا محسوس کرنے کی وجہ سے مذہب کو افیون کہا گیا۔ مگر یہ تو طے تھا کہ دنیا میں اپنی بہت ساری خامیوں کے باوجود ترقی پسند تحریک سے زیادہ کوئی تحریک انسانی زندگی کے فروغ میں معاون ثابت نہیں ہوسکی۔ میں بھی خود کو اس سے کیسے الگ کرسکتا تھا۔ میرے لئے تو معاملہ یہ بھی تھا کہ میں ۔نے زمیندارانہ قدروں

کا زوال دیکھا تھا۔ گھر اور گھر سے باہر پھیلی ہوئی مفلسی دیکھی تھی۔ ناانصافیوں کا لامتناہی سلسلہ دیکھا تھا۔ استحصال کی لمبی راتیں دیکھی تھیں۔ ظاہر ہے میرے لئے صرف یہی تحریک مشعلِ راہ ہوسکتی تھی۔ میں نے طالب علمی کے زمانے کی جدوجہد کے دوران پورے انہماک اور دیانتداری کے ساتھ زمینی سطح پر اس تحریک کے فروغ کے لئے ہر ممکن کاوش کی۔ تجربے، مشاہدے میرے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ میں نے بہار میں 'اپٹا' (IPTA) کو دوبارہ متحرک کرنے کا شرف حاصل کیا۔ کالج، ٹیوشن اور عارضی جائے اماں کے درمیان صبح سے دیر رات تک سفر میں رہا۔ کبھی کبھی تو کئی راتیں کوئیلری کے مزدوروں کے درمیان گزارتا رہا۔ مجھے یاد ہے کہ غیر منقسم بہار کے جھریا، کتراس گڑھ، دھنباد کے علاقے میں مزدوروں کے بیچ نکڑ ناٹک کیا کرتا تھا۔ انہیں متحرک کرنے کی کوششوں میں مشغول رہا۔ وہاں زندگی کے کئی رنگ دیکھے۔ کئی کہانیاں بھی ملیں۔ کہانی 'اندر آگ ہے' اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ وہاں یہ معلوم ہوا تھا کہ ہر مزدور اپنی جھونپڑی کے سامنے ایک پنجرے میں مینا کیوں پالتا ہے۔ مینا ہی تو زمین کے اندر پھیلنے والی آگ کا پتہ دیا کرتی تھی۔ ہم نے اپنے احساس کو اس چڑیا سے جوڑ کر دیکھا۔ تحریک میرے اندر اور شدت سے اترتی گئی۔ کہاں آگ ہے، اس کی تلاش کرنے لگا۔ گاؤں کو سچ مچ ہماری ضرورت تھی۔ مزدوروں، کسانوں، بے بسوں کے بیچ خود کو پاکر ایسا محسوس ہوا کرتا تھا کہ اصل ہندوستان تو انہیں میں بسا ہے۔ ان کے درمیان میری شخصیت کی تعمیر بھی ہوئی۔ اور ملک کے بڑے ترقی پسندوں نے میری بڑی ہمت افزائی کی۔ ان میں محمد حسن، قمر رئیس، اے کے ہنگل، کیفی اعظمی، کنہیا جی اور ایسے ہی کئی مشاہیر تھے۔ میں جب بھی دلی جاتا تو قمر رئیس سے ضرور ملتا۔ وہ ہمیں اس تحریک کے حوالے سے باخبر کرتے۔ ان کی شفقتوں سے میرا حوصلہ بڑھتا۔ اور میں خود کو مزید فعال بنانے میں لگ جاتا۔ افسانے لکھتا رہا۔ شاعری کرتا رہا۔ اردو ہندی کے مشاہیر کی سرپرستی بھی رہی۔ محمد حسن جیسے دیانت دار دانشور نے تو میرے افسانے 'پوسٹر' اور 'حربہ' کو عصری ادب میں نمایاں جگہ دی ساتھ ہی انہوں نے ایڈیٹوریل میں ان افسانوں پر خاطر خواہ گفتگو کی۔

یہ وہ دور تھا جب میرا تخلیقی سفر شروع ہوا تھا میں اسی اعتماد کے تحت رسائل کو تخلیقات بھیج دیا کرتا اور بہت اہتمام کے ساتھ لوگ انہیں شائع بھی کرتے تھے۔ شاید یہ ایک بڑی وجہ تھی کہ مجھے کبھی کسی نقاد یا مشاہیر سے لکھوانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ مجھے کبھی مخصوص مفاد کے تحت کسی لابی میں شامل ہونے کی ضرورت ہی درپیش نہیں آئی۔ ہاں، میں سبھوں کو ان کی اہلیت کے اعتبار سے قدر کی نگاہ سے دیکھتا رہا۔ پڑھے لکھے اور پر اعتماد دانشوروں نے بارہا اپنی سطح پر میری تخلیقات کے حوالے سے نہ صرف یہ کہ بہت کچھ لکھا بلکہ ذاتی گفتگو میں بھی بڑی ہمت افزائی کی۔

مجھ پر نام نہاد اردو سیاست کا اثر اس لئے نہیں پڑا کہ میں شروع سے ہی بتدریج اردو کے ساتھ ہندی رسائل میں بھی شائع ہوتا رہا۔ ظاہر ہے اس سے مجھے موضوعاتی او فکری سطح پر بہت پھیلنے کا موقع ملتا رہا۔ اردو کے ساتھ ہندی کے عصری ادب میں بھی اسی اہتمام کے ساتھ تخلیقات شائع ہوتی رہیں۔ میں نے نقاد مبصر کے حلقے کو کبھی زیادہ ترجیح نہیں دی کیوں کہ میرے لئے میرا قاری یا سامع ہی سب سے معتبر رہا ہے۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے ادب میں اپنے اثر ورسوخ یا لابی کی وجہ سے جن تخلیق کاروں نے جگہ بنائی ہے یا جن پر مشاہیر سے بہت کچھ لکھوایا گیا ہے وہ انعام واکرام سے تو نوازے گئے یا مخصوص حلقے نے انہیں جانا بھی۔ مگر ان کے پاس گورکی، پریم چند، منٹو، کرشن چندر، بیدی یا پھر غالب، شیکسپیئر، اقبال، فیض، احمد فراز جیسے قارئین و سامعین کبھی نہیں ملے۔ اس بھرم کو دور کرنے کے لئے آج کے نام نہاد اثر ورسوخ رکھنے والے تخلیق کاروں کو چاہئے کہ وہ کسی مجمع میں جا کر دانشور قارئین سے ہی سہی اچانک پچھلی یا بیچ کی صف میں بیٹھے ہوئے کسی سامع کو اٹھا کر بھری محفل میں یہ سوال کریں کہ ازراہِ کرم آپ یہ بتائیں کہ آپ نے میری کون سی تخلیق پڑھی ہے؟ اور اس تخلیق میں کچھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے؟ اگر ان میں یہ حوصلہ ہو جائے تو ممکن ہے خود احتسابی کا مقصد پورا ہو جائے۔ قمر رئیس، احمد فراز، محمد حسن، انتظار حسین، جانکی ولبھ شاستری، ندا فاضلی، شہریار، بیکل اتساہی، نامور سنگھ، رویندر راج ہنس، وہاب اشرفی اور ایسے ہی بزرگوں سے اس موضوع پر

میں نے بارہا گفتگو کی اور وہ مجھ سے متفق بھی ہوئے تھے کہ ہمارے پاس نقاد تو ہے، مبصر تو ہے، کتاب تو ہے، عہدہ تو ہے، اثر و رسوخ تو ہے مگر سچا قاری کہاں ہے؟ کہاں کھوگیا ہے ان کا قاری، کس بھرم میں کھوگئے ہیں وہ لوگ، کس بات کے لئے انہیں انعام واکرام سے نوازا جارہا ہے۔ وہ کس منہ سے 'کعبہ' جانا چاہتے ہیں؟ یہ حال صرف ادب کا نہیں ہے۔ تحریک کی صورت حال بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ ترقی پسند ادبی تحریک کے لئے زمینی سطح پر کام کرنے کے بعد جب دھول میں اَٹے ہوئے چہرے کیچڑ میں سَنے ہوئے پاؤں کے ساتھ میں قمر رئیس کے دولت کدے پر پہنچا اور ان سے یہ سوال کیا کہ یہ جو لندن میں ترقی پسندوں کی ادبی کانفرنس ہورہی ہے۔ اس میں ہندوستان کے جو ترقی پسند شامل ہورہے ہیں کیا ان میں بیشتر کا تعلق ترقی پسندی کی اصل روح سے کبھی رہا ہے؟ کیا گاؤں کی سوندھی مٹی یا مزدوروں کے پسینے سے ابھرنے والی کسی شخصیت کو اس کانفرنس میں جانے کی اجازت نہیں ہے؟ میں نے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ جس طرح ترقی پسند اصولوں کے تحت زمینی سطح پر اس تحریک کے لئے کام کررہے ہیں کیا ہمیں لندن کی شفاف دھرتی پر احترام کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا ہے۔ قمر رئیس صاحب کے ساتھ لندن یا روس کے سفر میں ہم جیسے لوگ کبھی نہیں رہے، ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ کیوں کہ ہمارے یہاں پروفیسروں کی ایک الگ لابی ہے جو ترقی پسندی، جدیدیت یا انتہا پسندی یا مابعد جدیدیت کے رومانی تصور کے ساتھ وابستہ رہی۔ ہم تو جذباتی استحصال کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور یہی وجہ بھی رہی ہے کہ ہمارے یہاں ایسی تحریکوں نے دھیرے دھیرے اپنا اثر کھودیا۔ آج جو ترقی پسندی ہے وہ دراصل ہماری رگوں میں صرف اس لئے رچی بسی ہے کہ یہ نجی تجربے اور مشاہدے پر مبنی ہے۔ ہم تو اپنی تحریروں، تقریروں کے حوالے سے اب بھی وہی کہتے ہیں جو دنیا کا کوئی بھی ترقی پسند شخص کہتا ہے یا کہہ سکتا ہے۔ ہاں بزرگوں کے چہروں کو ہم نے جس طرح دیکھا تو اکثر یہ شعر بھی ذہن میں گونجتا رہا:

چھوڑو تم انقلابِ زمانہ کا تذکرہ
وہ اور تھے جو حرفِ مقدر بدل گئے

مگر آج بھی کچھ ایسے دیوانے لوگ ہیں جن کی وجہ سے انسانیت کا احترام کیا جاتا ہے۔ جن کی وجہ سے محنت کو واقعی بلند مقام حاصل ہے۔ محمد حسن جیسے لوگوں کا موقف آج بھی زندہ ہے۔ اور انہوں نے کبھی نام نہاد ترقی پسندوں سے بھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ یہی وجہ تھی کہ انہیں بھی حاشیے پر رہنے میں کسی نے کسر باقی نہ چھوڑی۔

ہم اگر چاہیں تو فرداً فرداً اپنے افسانے پر گفتگو کر سکتے ہیں۔ لیکن میں اسے ضروری نہیں سمجھتا کیوں کہ قاری کو انھیں اپنی پسند ناپسند کے حوالے سے ہی دیکھنا چاہئے۔ میں خود کو خوش نصیب تصور کرتا ہوں کہ اگر کسی نے ایک بار پورے انہماک کے ساتھ مجھے پڑھ لیا تو اسے کہیں نہ کہیں ہماری تخلیقات میں اپنے ہونے کا احساس ضرور پیدا ہوتا رہا ہے۔ میں نے اب تک اپنے ہزاروں قارئین اور سامعین سے باتیں کی ہیں۔ انہیں غور سے سنا ہے۔ میں نے ان کو ہی اپنی تخلیقی زندگی کا بہترین اثاثہ تصور کیا ہے۔ میرے قارئین میں لفظ لفظ جوڑ کر پڑھنے والا قاری بھی ہے اور اپنے تخیلات سے، اپنے فکری مشمولات سے دنیا کو متاثر کرنے والا تخلیق کار و نقاد بھی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے زیر اہتمام ایک بین الاقوامی مشاعرے میں جب میں نے اپنا کلام پیش کیا اور سامعین نے اس کی بے حد پذیرائی کی ساتھ ہی میڈیا نے بہت احترام کے ساتھ مجھے پیش کیا تو احمد فراز جیسا بین الاقوامی شاعر بھی اپنے جذبات نہیں روک سکا۔ انہوں نے مشاعرے کے بعد مجھ سے تفصیلی گفتگو کی تھی۔ میں ششدر تھا کہ احمد فراز نے بحیثیت افسانہ نگار ہندوپاک کے رسائل کے توسط سے مجھے پڑھا تھا اور پوسٹر، کتّی کا راجکمار، اندر آگ ہے، سبارو نہیں سکتی، درد گزرا ہے دبے پاؤں اور آشرم جیسا افسانہ انہیں یاد تھا۔ ان افسانوں میں پیش کردہ کردار ان کے ذہن میں محفوظ تھے۔ احمد فراز نے بتایا تھا کہ تمہاری

شاعری میں ایک واضح تصور ہے۔ بھرپور تخلیقیت ہے اور شاید تمہارے افسانوں کا نقطۂ عروج بھی تمہارے اشعار میں جا بجا موجود ہے۔ اس کے بعد بھی وہ بہت کچھ کہتے رہے مجھے یاد بھی نہیں۔ کیوں کہ ایک عالم گیر شخصیت مجھ جیسے ادنیٰ سے تخلیق کار کی پذیرائی کر رہی ہو تو پھر ماحول سحر زدہ ہو ہی جاتا ہے۔ پھر احمد فراز سے ادبی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ گفتگو ہوتی رہی۔ کیا معلوم تھا کہ احمد فراز جب آخری بار پٹنہ آئے تو انہوں نے یہ شعر سنایا تھا:

هم اس کے شہر میں ٹھہریں کہ کوچ کر جائیں
فراز آؤ ستارے سفر کے دیکھتے ہیں

وہ لمبے سفر پر چلے تو گئے مگر مجھ جیسے معمولی سے تخلیق کار کو اعتماد کی وسیع تر زمینیں عطا کر گئے۔ اسی طرح ایک اور واقعہ ہے کہ عہد ساز فکشن نگار انتظار حسین کو جب ہندوستان میں پریم چند فیلوشپ کے لئے منتخب کیا گیا تو وہ سفر کے دوران پٹنہ بھی تشریف لائے یہاں کے ہوٹل موریہ میں ٹھہرے۔ مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو میں خود کو بے حد خوش نصیب تصور کرنے لگا۔ ہوٹل کے کمرے میں ان سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ میں نے گفتگو کا ذکر مختلف اخبارات کے توسط سے کر بھی دیا ہے۔ عصری افسانے پر گفتگو کے دوران میں نے ان سے کہا تھا کہ پریم چند جیسے فکشن نگار کے پاس آج بھی اس کے قارئین کا بڑا حلقہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم جو لکھنے والے لوگ ہیں انہیں زندہ تو صرف ہمارے قارئین ہی رکھ سکتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سو سال سے زیادہ کا طویل وقفہ گزر چکا ہے اور پریم چند کی معنویت برقرار ہے۔ چونکہ پریم چند پر میں نے بہت کام کیا ہے۔ اس لئے انتظار حسین کے سامنے مؤدبانہ لہجے میں یہ موقف ظاہر کیا تھا کہ ہمارے یہاں تنقید کی صورت حال عجیب رہی ہے لوگ قاری سے نہیں بلکہ نقاد سے پوچھ کر اپنا موقف ظاہر کرتے ہیں۔ پریم چند نے یوں تو بہت ساری کہانیاں لکھیں۔ 'کفن' بھی ان کی عمدہ کہانی ہے۔ مگر میری نظر میں وہ ان کی سب سے خوبصورت کہانی نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کا پہلو

آفاقی نہیں ہے۔ بلکہ 'پوس کی رات' جیسی کہانی میں احساس اور متن کی سطح پر زیادہ آفاقیت ہے۔ انتظار حسین نے نہ صرف یہ کہ میری بات سے متفق تھے بلکہ انہوں نے بتایا کہ میں برسوں سے یہی سوچ رہا ہوں اور پورے دلائل اور حقائق کے ساتھ 'پوس کی رات' کو ہی پریم چند کی سب سے اعلیٰ تخلیق مانتا ہوں۔ یہاں میرا صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ ہم جیسے لوگوں کی فکر اگر مشاہیر سے ملتی ہے تبھی وہ فکر بڑی کیوں ہوتی ہے؟ انتظار حسین جیسا عظیم ترین تخلیق کار ایک ذمہ دار قاری کی حیثیت سے بھی تو سوچ سکتا ہے۔ یہاں یہ تصور واضح ہو جاتا ہے کہ اگر ہم اپنے وژن اور اپنی فکر کے ساتھ کسی بھی تخلیق پر سوچیں اور اپنا بے باک تبصرہ پیش کریں تو ممکن ہے کہ ہمارے دائرے کے وسیع ہونے کے اور بھی امکانات روشن ہو جائیں۔

احمد یوسف شریف النفس افسانہ نگار تھے۔ میرے افسانوی مجموعے 'پوسٹر' پر ایک شام کا انعقاد کیا گیا تھا جس کی صدارت کرتے ہوئے احمد یوسف نے کہا تھا کہ 'پوسٹر جیسا افسانہ کبھی کبھی سرزد ہوتا ہے۔' معروف نقاد پروفیسر محمد حسن نے عصری ادب کے ایڈیٹوریل میں بھی کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا۔ احمد یوسف صاحب سے میں نے یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ کیا افسانہ بھی کسی الہامی کیفیت کے تحت عمل میں آتا ہے؟ تخلیقی بیانیہ کے ساتھ تو یہ معاملہ ہو سکتا ہے۔ لیکن افسانے پر اگر الہامی کیفیت طاری ہو جائے تو ممکن ہے کہ کہانی کہیں ڈوب جائے۔ میں تخلیقی بیانیہ کو بہت احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ کیوں کہ اگر کسی تخلیق کار کو یہ وصف حاصل ہو جاتا ہے تو پھر اسے کوئی بھی چاہ کر مٹا نہیں سکتا۔ اور اس کا یہ عمل اس کے فطری فنکار ہونے کی غمازی بھی کرتا ہے۔ مگر کہانی کے لئے کچھ بڑی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ اور وہ ہے قاری سے کہانی پن کی سطح پر رشتے کا استوار ہونا۔ 'پوسٹر' میرے لئے محض الہامی کیفیت کا نام نہیں ہے بلکہ زمین سے ابھری ہوئی حقیقتیں اس کہانی کا ماخذ ہیں۔ میں کہہ چکا ہوں کہ اردو ہندی اور دوسری زبانوں کے عصری ادب میں اس کہانی کا شامل کیا جانا میرے لئے یقیناً باعث صد افتخار رہا ہے۔ لیکن اس کہانی سے ایک دلچسپ کہانی بھی وابستہ ہوگئی ہے اور وہ یہ کہ جب 'پوسٹر' میری شناخت کے

ساتھ جڑ گئی تو ایک نام نہاد لابی کو یہ سب کچھ ناگوار سا لگنے لگا۔ اس لابی نے ایک جونیئر کہانی کار کو کھڑا کیا اور اس سے 'پوسٹر' کے عنوان سے ہی ایک کہانی لکھوائی۔ عالمی عصری ادبیات سے میری کہانی کو انڈر ٹون کرنے کی غرض سے یہ عمل کیا گیا تھا اور بجائے میری اس کہانی کا ذکر کرنے کے اس نئے افسانہ نگار کی پوسٹر کا ذکر کچھ دنوں تک جاری رہا۔ مگر میری کہانی اتنی دور تک پھیل چکی ہے کہ وہ خود میری دسترس میں بھی نہیں رہ گئی ہے۔ اب ذرا سوچئے کہ جہاں ادب میں ایسا عامیانہ عمل کیا جاتا ہو وہاں قاری سے زیادہ نام نہاد تخلیق کاروں پر کس طرح بھروسہ کیا جاسکتا ہے؟ کچھ لوگ اپنے کمپلکس میں ہی تمام عمر گزار دیتے ہیں۔ مگر مجھے ندا فاضلی کا یہ شعر ہمیشہ رہنمائی کرتا رہا ہے:

شائستہ محفلوں کی فضاؤں میں زہر تھا
زندہ بچے ہیں ذہن کی آوارگی سے ہم

ندا فاضلی سے قربت کی ایک بڑی وجہ یہ رہی ہے کہ ان کے افکار نے بھی میری بڑی رہنمائی کی ہے۔ ہم نے کبھی صلے کی پرواہ نہیں کی۔ کبھی کسی سے کوئی توقع نہیں رکھی۔ کبھی اپنے احساس کے زخموں کو مندمل نہیں ہونے دیا۔ کبھی خوش فہمیوں کے حصار میں نہیں رہا۔ کبھی کسی کی تعریف یا کسی کی سازش سے خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوا بلکہ دانستہ طور پر بھی نادانی اوڑھے رہا۔ ہمارے کچھ تخلیق کار میرے مضامین کی ہمیشہ پذیرائی کرتے رہے ہیں۔ خصوصی طور پر میرے تخلیقی بیانیہ کو باوقار تصور کرتے رہے۔ ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ میں ان کی تخلیقات پر اظہار خیال کروں۔ میں نے ایسا کیا بھی۔ اور اتنا کچھ لکھا ہے کہ کم سے کم دو ضخیم مضامین کے مجموعے بھی شائع ہو سکتے ہیں۔ میرا ہمیشہ یہ ماننا رہا ہے کہ چاہے تیسرے درجے کی بھی تخلیق ہو وہ بہرحال احترام کی نگاہ سے دیکھی جانی چاہئے کیوں کہ اس سے بہتر یا مقدس کوئی عمل ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ لوگ تنقید کی زنگ آلودہ تلواروں سے ایسی تخلیقات پر ضرب لگانے کی کوشش

کرتے ہیں۔ میں نے لوگوں سے یہ بتایا کہ نقاد ہونا بہت مشکل ہے اور خصوصی طور پر تخلیق کا نقاد ہونا۔ کیوں کہ نقاد اگر تخلیق کار سے بہتر تخلیق پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو پھر اسے حق حاصل ہے کہ وہ اس تخلیق پر منفی رائے بھی دے سکے۔ اگر اس کے اندر ایسی صلاحیت نہیں ہے تو پھر اس کی حالت اس وکیل سے زیادہ نہیں ہوتی جو قتل کے جھوٹے مقدمے میں اپنے دلائل اور حقائق سے قاتل کی جیت کے لئے راہیں ہموار کر دیتا ہے۔ آج ہماری تنقید اسی لئے بے اثر ہوگئی ہے کہ پہلے سے بنے بنائے ہوئے اصولوں پر ہم تنقید کی عمارت تعمیر کر رہے ہیں یا پھر کسی سے مرعوب ہو کر توصیفی کلمات سے نوازنے کے لئے مجبور ہیں۔ میں نے اشارہ کیا ہے کہ تیسرے درجے کی تخلیق بھی میرے لئے ہمیشہ محترم رہی ہے۔ میں نے پوری عرق ریزی کے ساتھ ان پر لکھا بھی ہے۔ لیکن یہ حوصلہ ان تخلیق کاروں میں کبھی نہیں رہا کہ وہ میری تخلیق کے حوالے سے کم از کم اپنی نجی گفتگو کو بھی قلم بند کرا دیں۔ ظاہر ہے اس میں مصلحت پسندی کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ تخلیق کار آزاد ہوتا ہے۔ نجی محفلوں میں اگر میرے لئے فضا ہموار ہے تو پھر وہ وہاں لبیک کہتا ہے یا ناہموار ہے تو وہ میرا بڑا ناقد بھی بن جاتا ہے۔ میرے لکھنے کا فائدہ تو بہتوں کو ہوا۔ چاہے انعام و اکرام کا معاملہ ہو یا اپنی ادبی دکان کو سجانے سنوارنے کا معاملہ ہو، میرے مضامین نے یقیناً ان کے مقاصد کی تکمیل میں اہم رول ادا کیا لیکن میرا حال تو یہ ہوا کہ

میں تو غزل سنا کے اکیلا کھڑا رہا
سب اپنے اپنے چاہنے والوں میں کھو گئے

یہ جس آوارگی کا ذکر میں نے کیا ہے دراصل اس نے میری بڑی رہنمائی کی ہے۔ اور میں اسے اپنی زندگی کا موقف بھی مانتا ہوں۔ اسی لئے ادب یا زندگی میں اگر کوئی شخصیت بتدریج ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے بہت کم وقت میں سماجی یا ادبی سرد کار کے بغیر کوئی مقام حاصل کر لیتی ہے اور وہ اپنی بلندیوں سے ہماری پستیوں کو دیکھ کر زیرِ لب مسکراتی ہے تو مجھے یہ احساس

ہوتا ہے کہ کاش! ان کی سیڑھیاں ہمارے ہاتھوں میں نہیں ہوتیں ۔ کاش! میرا ذہن انہیں پستیوں کا پتہ دے پاتا۔ چونکہ ان کی بلندیاں بے حسی اور کم مائیگی پر ٹکی ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ ہماری دی ہوئی زمین کی خودمختاری کے بھرم جال میں بھی گرفتار رہتے ہیں۔'

نئی نسل میں جو بیداری پیدا ہوئی ہے اگر اسے مستقبل میں بھی جائے اماں ملی تو میرا دعویٰ ہے کہ دنیا کی کوئی بھی لابی غیر جینوئن افراد کو بے جا بلندیوں تک نہیں پہنچا سکے گی۔ میں اس سلسلے میں یہ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ مسقط یونی ورسٹی سے انگریزی کے نئے نقاد پروفیسر افروز اشرفی نے عالمی ادبیات کے حوالے سے اردو فکشن پر کام شروع کیا۔ انہوں نے بہت سارے ترجمے کئے۔ اردو کے بھی اور دوسری زبانوں کے بھی۔ انہیں روایتی ڈھنگ سے مجبور کرنے کی کوشش کی گئی کہ اردو کے جو فکشن نگار نیوز میں ہیں اور بعض وجوہات کی بنا پر حوالوں میں ہیں۔ ان کی تخلیقات کے ہی تراجم کئے جائیں۔ پروفیسر افروز چونکہ عالمی ادبیات پر نظر رکھتے ہیں اس لئے انہوں نے اپنے وژن کے ساتھ یہ کام شروع کیا۔ اسی دوران انہوں نے میری کہانی بھی پڑھی۔ انہیں 'اندر آگ ہے' کے علاوہ میری دوسری کئی کہانیاں پسند آئیں اور پھر ایسا ہوا کہ انہوں نے میری ساری کہانیاں پڑھ ڈالیں ۔ ہندوستانی ادب کی کہانیوں سے ان کا تقابلی مطالعہ بھی کیا اور پھر اس نتیجے پر پہنچے کہ قاسم خورشید کی پندرہ منتخب کہانیوں پر مشتمل ایک کتاب انگریزی میں ترتیب دی جائے۔ ساری کہانیوں کے ترجمے انگریزی میں ہوئے اور پھر انہیں دنیا کے بڑے انگریزی پبلشر کے حوالے کردیا تا کہ کتاب شائع ہوکر منظر عام پر آجائے۔ یہاں یہ ذکر اس لئے ناگزیر ہے کہ پروفیسر افروز اشرفی نے دراصل میری کہانیوں کا انتخاب اس لئے بھی کیا کہ وہ عصری عالمی فکشن کے ساتھ ان کا تقابلی مطالعہ پیش کرسکیں۔ یہ کام بہرحال پرانا نقاد نہیں کرسکتا تھا۔ کیوں کہ وہ پرانی تحریروں کے حوالے سے ہی اپنی شناخت قائم کرنے کی کوشش میں ہوتا ہے۔ ہمارے ایسے نام نہاد نقاد کہتے ہیں کہ نئے تخلیق کاروں کو خود اپنا نقاد پیدا کرنا چاہئے یا خود اپنا نقاد ہوجانا چاہئے۔ میں ان کا احترام کرتا ہوں اور یہ مشورہ دیتا ہوں کہ نیا

فنکار تو اپنی دنیا خود تلاش کر ہی لے گا اب واقعی پرانی تحریروں کو روایتی انداز میں پڑھنے کی کسی کو فرصت بھی کہاں ہے؟

بعض ایسے نقاد ضرور ہیں جو وقت کی آہٹوں کو صاف طور پر سن رہے ہیں۔ انہیں احساس ہے کہ گزشتہ بیس پچیس برسوں میں دنیا میں خاصی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے ہمارا ادب بھی اس سے الگ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کلاسیکی روایات کی زمین پر نئے ادب کی آبیاری کو محسوس کرتے ہوئے اپنے موقف میں صحت مند تبدیلی لائی ہے۔ ان میں گوپی چند نارنگ، وہاب اشرفی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ نارنگ اور وہاب اشرفی نے مابعد جدیدیت کے حوالے سے نئے ادب پر خاطر خواہ بحث کرتے ہوئے وہ اپنا واضح تصور پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی ادبیات میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے کما حقہ اردو والے واقف ہو رہے ہیں۔ چونکہ گوپی چند نارنگ نے ہر دور میں نئے ادب کو پیش نظر رکھ کر یہ کوشش کی ہے کہ اردو کی نئی عالمی بستیاں کس طرح آباد ہو سکتی ہیں۔ اس میں اپنے آپ کو وسعت دینے کی ضرورت تھی ساتھ ہی کسی خوش فہمی کے بغیر ادب گڑھنے پر زیادہ زور دینا تھا۔ نارنگ سے ہزار اختلافات کے باوجود لوگ اردو میں نئے میلانات پر ان کی آراء کو ہی معتبر تصور کرتے ہیں۔ وہاب اشرفی نے جب مابعد جدیدیت کے حوالے سے اردو ادب کے رجحانات پیش کرنے کی کوشش کی تو اس میں تخلیقات کا بڑا حصہ نئے ادب سے مستعار ہے۔ میری کہانی 'سائمن باسکی' کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے واضح طور پر کہا ہے کہ ''قاسم خورشید کی 'سائمن باسکی' مجھے آج بھی گرویدہ کیے ہوئے ہے۔ پہلے میں نے اسے محض مزدوروں کے استحصال کی کہانی کے طور پر پڑھنے پر بس کیا تھا لیکن تاثر دیرپا تھا۔ اب جب کہ قاسم خورشید کا افسانوی سفر کافی آگے بڑھ گیا ہے۔ اس کہانی کی سماجی اور تہذیبی معنویت مزید گہری ہوگئی ہے۔ یہ کہانی مزدوروں کی پسپائی پر ختم نہیں ہوتی بلکہ یہاں شکستہ حالات میں بھی آگے بڑھنے کا حوصلہ ختم نہیں ہوتا۔ یہ وہی روشنی کی کرن ہے جسے مابعد جدیدیت اپنانا چاہتی ہے''۔ اسی طرح نامور تخلیق کار انور سدید نے جب میری کہانی 'کنی کا راجکمار' کا مطالعہ کیا تو انہیں شدت سے یہ احساس ہوا کہ نئی کہانی اب

موضوعات اور ہیئت کی سطح پر اپنی الگ کائنات گڑھ رہی ہے۔ اس کہانی میں حسیت کو لے کر انور سدید نے نئے نکات پیش کئے۔ انہوں نے یہ اعتراف کیا تھا کہ قاسم خورشید اس موضوع کو جس طرح برتنے کی کوشش کی ہے یہ ان کا ہی حصہ ہے۔ بظاہر جو موضوع عام طور پر ہماری دسترس میں نہیں ہوتا قاسم خورشید پوری فنی چابکدستی کے ساتھ نہایت موثر انداز میں اس پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ مشاہیر کی آراء کا سلسلہ بھی خاصا طویل ہے۔ بس جو کچھ یاد آیا اس کے ساتھ ہولیا۔

حالانکہ ہندوستان کی سلطنت سے بہت دور ایک چھوٹے سے گاؤں کاکو سے اپنا سفر شروع کرتے ہوئے پٹنہ پہنچا اور اسی خرابے میں رہ کر ساری دنیا میں اپنی تخلیقات کے حوالے سے جانا پہچانا گیا۔ سچ ہے کہ میرے پاس میری تخلیق کے سوا کبھی کوئی سرمایہ نہیں رہا۔ اگر بڑے تخلیق کار کا خانوادہ ہوتا، دولت ہوتی، او بلائز کرنے والا عہدہ ہوتا یا ہندوستان کی راجدھانی میں بسا ہوتا تو ممکن ہے ہماری تخلیقات کی جو پذیرائی عوامی سطح پر ہوئی اس کا خاطر خواہ صلہ بھی مل جاتا۔ دلّی تو ایسا شہر ہے جہاں ساری دنیا کے ادباء، شعراء، محقق، مدبّر بھی تشریف لاتے ہیں اور لوگ ان سے خاطر خواہ استفادہ بھی حاصل کرتے رہتے ہیں۔ مگر چھوٹے شہروں یا گاؤں کے ادیبوں وشاعروں کا المیہ رہا ہے کہ انہیں تب تک خواص میں قبولیت کا شرف عطا نہیں ہوتا جب تک وہ مکتوبی ادیب یا ترسیل کے دوسرے ذرائع سے ہمیشہ خواص کی توجہ اپنی طرف مبذول نہ کرواتے رہیں۔ ہمارے یہاں یوں تو بہت کچھ بہتر لکھا گیا ہے لیکن پروجکشن نہیں ہونے کی وجہ سے دوسرے اور تیسرے درجے کے ادب اور ادیبوں کا دور دورہ رہا ہے۔ مجھے اب بھی صلے کی پرواہ نہیں ہے لیکن ادب کے نام پر اگر واقعی منصفانہ فیصلے کئے جانے لگے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ بہتر ادب اور ادیبوں کو ان کا مناسب مقام مل سکے گا۔ یہ کام جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ کیوں کہ اب کسی کو یہ فرصت نہیں ہے کہ وہ جینوئن تخلیق کار کی تلاش میں سرگرداں ہو اور تمام مصلحتوں سے دور ہٹ کر ان کے صحیح مقام کا تعین کر سکے۔ اپنے قارئین کی لگاتار محبتوں کا میں اسیر رہا ہوں۔ اس لئے کبھی ایسا محسوس نہیں کیا کہ ہماری تخلیقات ضائع ہوئی ہیں۔ اپنے پڑھنے والوں

کے مشورے اور لگاتار کہانیوں پر گفتگو کے بعد یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوا کہ موجودہ عہد اور مستقبل کے لئے ان کہانیوں کا انتخاب پیش کیا جائے جو موضوعات، پیش کش، ہیئت اور متن کی وجہ سے کافی مقبول رہی ہیں۔ میں اعتماد کے ساتھ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میری کہانیوں سے گزرنے کے بعد کوئی بھی حساس دل یقیناً مجھے اپنے دل کے کسی گوشے میں ضرور جگہ دے سکے گا۔ کہانیوں کی بڑی تعداد ہے۔ انتخاب بھی مشکل ہے۔ لیکن میرے لئے یہ کام یوں آسان ہوگیا کہ قارئین یا معتبر ناقدین نے جن کہانیوں کو نگاہ انتخاب میں رکھا میں نے ایسی ہی کہانیاں پیش کی ہیں۔ اب میں یہ نہیں کہتا کہ تمام تر کہانیاں اپنی مخصوص شدت کی وجہ سے ہر قاری کو متحرک کریں گی مگر یہ اعتماد ہے کہ میرا کوئی افسانہ ریڈیبلیٹی کی سطح پر کسی بھی قاری کو ضرور متوجہ کرنے میں کامیاب ہوگا۔

اردو کہانیوں کے حوالے سے اکثر یہ رائے قائم کرلی جاتی ہے کہ یہاں موضوعات کا تنوع نہیں ہے جبکہ انگریزی، ہندی، بنگلہ اور دوسری زبانوں میں جو کہانیاں لکھی جارہی ہیں، ان کے موضوعات کا فلک بہت طویل ہے۔ میں بھی بہت حد تک یہ اعتراف کرتا ہوں کہ نہ جانے کیوں اردو کہانیوں میں نئے موضوعات کے برتنے میں وسعت قلبی سے کام نہیں لیا جاتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہم نے روایت سے انحراف کیا تو ممکن ہے اس کا خاطر خواہ اثر نہ ہو پائے۔ نفسیاتی سطح پر ایسا سوچنا اردو مزاج کے عین مطابق بھی ہے۔ بہتوں نے یہ ہمت دکھائی کہ انگریزی یا ہندی فکشن میں جس تنوع کے ساتھ تخلیقات پیش کی جارہی ہیں ان کی پیروی کی جائے۔ مگر اردو میں منتقل ہونے کے بعد ایسا ادب یا تو رپورٹ بن کر رہ گیا یا پھر محض فنتاسی سے تعبیر کیا گیا۔

دراصل تخلیقی ادب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے قاری یا سامع کو متحرک کرسکے۔ متحرک کرنا بھی بہت عرق ریزی کا کام ہے۔ اس لئے موضوعات کے برتنے میں نہایت دیانتداری کے ساتھ اس آنچ کا ہونا ضروری ہے جسے ہم فطری طور پر محسوس کرنے

کے اہل ہوں۔ میں اپنی کہانیوں کے حوالے سے بھی کوئی دعویٰ پیش نہیں کرتا لیکن لگاتار ہندی اور اردو میں لکھتے اور پڑھتے رہنے سے کم از کم یہ ضرور ہوا کہ وسیع تر حلقہ ملا۔ بہت سی فرسودہ روایتیں خود بخود پیچھے چھوٹ گئیں۔ ترسیل کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں آیا۔ چاہے کسی بھی مذہب فرقے یا مسلک سے تعلق رکھنے والا قاری ہو، اسے کہیں نہ کہیں میری کہانیوں میں اپنے ہونے کا احساس زندہ ہوتا رہا ہے۔ پوسٹر، اندر آگ ہے، سائمن باسکی، وہ لڑکی، کنّی کا راجکمار، کاہے راکھے سائیاں، آشرم، روگ، میا، سبا رو نہیں سکتی، رات، پھانس، باگھ دادا، حربہ، کوئی ہاتھ، کشن پور کی مسجد یا ایسی دوسری تمام کہانیوں کا بغور مطالعہ کریں گے تو شاید مجھے بھی احساس ہوگا کہ میں نے پورے اعتماد کے ساتھ تخلیقی شدت کے پیش نظر ہی موضوعات کو برتنے کی کوشش کی ہے۔ اور کہیں ایسا نہیں معلوم ہوگا کہ خود کو دہرا رہا ہوں۔ میں ایسا اس لئے بھی کہہ رہا ہوں کہ اب تک جو تاثرات ملے ہیں، مجموعی اعتبار سے ایسی ہی باتیں، کہی گئی ہیں۔ ان افسانوں کا انتخاب بھی میں نے نہیں کیا ہے بلکہ اس عمل میں دانشوروں اور انہماک سے مطالعہ کرنے والے قارئین کے فیصلے کا ہی دخل ہے، تخلیقی ادب کا کوئی خاص مقام کبھی متعین نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ یہ تو لامتناہی سلسلہ ہے اور شاید بے منزل کی تلاش بھی ہے۔ زندگی کے کینوس پر کئی ایسی تصویریں ہیں جو میرے وجود کا حصہ ہیں۔ میں اپنی تنہائیوں میں انھیں جینے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس عمل میں کوئی جستجو ہی مجھے حوصلہ عطا کرتی ہے۔ ہاں یہ ضرور سوچتا ہوں کہ دوران سفر اوروں میں منتقل ہو جاؤں اور یہ گمان بھی باقی نہ رہے۔

جستجو ہو تو سفر ختم کہاں ہوتا ہے
یوں تو ہر موڑ پہ منزل کا گماں ہوتا ہے

قاسم خورشید

09334079876

ترتیب

**

باگھ دادا

کچھ دھندلی سی یادیں ہیں میرے ساتھ۔

کوئی چھ سال کا رہا ہوگا۔ کافی زمین میں پھیلا ہوا تھا بچپن کا وہ مکان۔ ایک بہت بڑا آنگن تھا۔ میرے دادا ابا تین بھائی تھے۔ انتہائی باعزت گھرانہ۔ زمینداری جا چکی تھی۔ کہیں نشانات بھی باقی نہیں تھے۔ خاندان میں اب غریبی پھل پھول رہی تھی۔ وہ زور زور سے قہقہے لگایا کرتی۔ اپنے ہی مختلف چہرے بنا کر لوگوں کو ہنسایا کرتی۔ تینوں گھروں کے بچے خوب شور مچایا کرتے۔ بھلا کسی کو احساس بھی کیسے ہو پاتا کہ زمیندار کے گھر سے رونقیں جا چکی ہیں۔ دیر رات تک طرح طرح کے قصے۔ پھر اسی دوران جو کچھ بھی ہوتا دسترخوان پر رکھ دیا جاتا۔ زنان خانے میں روٹیاں اکثر علامتوں کے زوال کی طرح ابھرتیں۔ مگر باہر مردوں کو احساس نہیں ہونے دیا جاتا کیوں کہ وہاں جو دسترخوان ہوتا وہ صرف گھر کے افراد کے لئے نہیں ہوتا بلکہ اکثر دو چار مہمان بھی شامل ہوا کرتے تھے۔

ہمارے گاؤں میں سب سے زیادہ عقیدت کا مقام تھا حضرت بی بی کمال کا روضہ۔ یہاں لوگ دور دور سے آیا کرتے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں بھی درگاہ پر چادر پوشی ضرور ہوا کرتی۔ کسی کو لمبی بیماری سے شفا ملی ہو، کوئی مڈل یا میٹرک پاس ہوگیا ہو۔ گاؤں کی ڈائن سے بچ گیا ہو۔ کسی کی شادی طے ہوگئی ہو۔ آپسی جھگڑے کے بعد صلح کا معاملہ ہو۔ عقیقہ، ختنہ، کان یا ناک چھدائی کی رسم ادائیگی ہو۔ حضرت بی بی کمال کے روضے پر عورتیں، بچے ملیدہ اور چادر

وغیرہ لے کر ضرور حاضر ہوتے۔ عورتوں کا قافلہ مغرب کے بعد نکلا کرتا اور پھر مختلف راہوں سے گزرتا ہوا عشاء کے وقت اس مزار پر پہنچتا۔ دراصل کچھ دیر اس لئے بھی ہوا کرتی تھی کہ راہ میں چھوٹے چھوٹے مزاروں پر بھی حاضری ضروری تھی۔ ان مزاروں پر ایک مٹی کے برتن میں ملیدہ اور دوسرے لوازمات رکھے جاتے۔ اگربتی کے ساتھ موم بتی بھی جلائی جاتی اس کے بعد قافلہ آگے بڑھتا۔ عورتیں مدھم لہجے میں گیت گا رہی ہوتیں۔ بچے کھلکھلاتے رہتے۔ کسی بوا کے سر پر ٹوکری ہوتی۔ کوئی پھولوں کی چادر کوئی سینی میں تھال لئے دھیرے دھیرے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا۔ اجتماعی طور پر کورس میں ابھرنے والے گیت میں میاں جان بہو اور اچھن بی کا بے سرا لہجہ الگ سے سنائی دیتا۔ کنواری لڑکیاں ہنسی روک نہیں پاتیں تو اچھن بی تنبیہ کرتیں۔

'توبہ! شریف گھر کی لڑکیوں کو ایسا کرنا کہیں زیب دیتا ہے؟'

تب شریف زادیاں ٹھٹھولی بند کرنے کے بعد اچھن بی کے سُر میں سُر ملانے پر مجبور ہو جاتیں۔

اسی طرح قافلہ مختلف مزاروں سے گزرتا چلا جاتا۔ ایسے ہی مزاروں میں ایک مزار تھا باگھ دادا کا۔ یہ مزار ٹھیک ہمارے گھر سے ملحق تھا۔ دادا ابا کے حکم سے اس کی دیکھ بھال ہمارے گھر کے افراد ہی کیا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اکثر میں، اپنے گھر کے باہر پتھر کی بنی ہوئی کرسی پر محض اس لئے موجود ہوا کرتا تھا کہ کب کوئی عقیدت مند باگھ دادا کے مزار پر آئے، فاتحہ پڑھے اور پھر ملیدہ وغیرہ رکھ کر جائے۔ بس جیسے ہی حاضری دینے والا وہاں سے گیا، دوڑ کر میں ملیدہ یا شیرینی لے کر آ جاتا تو اس وقت ہم بچوں میں جو بھی موجود ہوتا، مل بانٹ کر کھا لیتے۔

ایک سوال ہمیشہ میرے ذہن میں ہوا کرتا تھا کہ ہمارے گھر سے ہی ملحق کیوں ہے باگھ دادا کا مزار؟ دادی اماں نے جو سنا تھا، وہی بتایا اور پھر میں نے بھی مزید تحقیق کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ہاں نام پر ضرور تعجب تھا۔ بزرگ ہیں تو نام بھی کچھ ویسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ مگر یہ

نام کیوں پڑا۔ باگھ یعنی شیر۔ضرور رشتہ ہے کوئی۔ یا پھر بہادری کا کوئی کارنامہ بھی نام کی اصل وجہ ہوسکتی ہے۔ ہوا بھی ایسا ہی تھا۔ باگھ دادا بہت بہادر تھے۔ ہردلعزیز بھی۔ خدمتِ خلق کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ جب اس علاقے کے چاروں طرف گھنے جنگل تھے تو جنگلی جانوروں کا گاؤں میں آنا خالی از امکان نہیں تھا۔ سارا علاقہ اس کی دہشت میں تھا رات میں گاؤں کے لوگ باضابطہ پہرہ دیا کرتے تھے۔مگر اس کا بھی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہو پارہا تھا۔ کسی نہ کسی علاقے کا کوئی فرد یا پھر جنگل میں لکڑیاں چننے والوں میں سے کوئی ان کا شکار ضرور ہوجایا کرتا۔ ایک روز تو حد ہوگئی۔ گاؤں کی ایک بیوہ خاتون جن کا واحد سہارا ان کا پانچ سالہ بچہ تھا۔ وہ اس آدم خور کا شکار ہوگیا۔ گاؤں والوں کو بہت غصہ آیا۔لوگ مشعل لے کر آدم خور کی تلاش میں جنگل کے اندر داخل ہوئے۔ چاروں طرف اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ باگھ دادا سب سے زیادہ پریشان تھے۔ انہوں نے طے کرلیا تھا کہ اس آدم خور سے گاؤں کو ضرور نجات دلائیں گے۔ کئی دنوں تک وہ تنہا جنگل میں گھومتے رہے۔ جہاں موقع ملا، عبادت کی اور پھر اپنے کام میں لگ گئے اور بالآخر ایک رات آدم خور سے ان کا سامنا ہو ہی گیا۔ انہوں نے بہتوں کو مدد کے لئے بلایا مگر جب تک لوگ پہنچے، آدم خور ان پر حملہ کر چکا تھا۔ انہوں نے اس کے حملے کا منہ توڑ جواب بھی دیا۔ کافی تگ و دو کے بعد اس آدم خور کو تنہا مار ڈالنے میں کامیاب بھی ہوگئے۔مگر وہ اتنے زخمی ہو چکے تھے کہ کچھ دنوں بعد ہی زخم کی تاب نہ لاکر دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ گاؤں والوں کو آدم خور سے تو مکتی مل گئی تھی، مگر باگھ دادا کے گزر جانے کا سبھوں کو بہت دکھ تھا۔ وہ ایک مسیحا بن کر آئے اور لوگوں کی عقیدت کا مرکز بن گئے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان کا آبائی وطن کہاں تھا۔ ان کے دفن کیے جانے کے بعد گاؤں والوں نے مزار کی حد بندی بھی کرڈالی۔ دھیرے دھیرے بستی اور آباد ہوئی مگر جنگل دور ہوگیا۔ پھر باگھ دادا کا مزار ہماری زمین سے ہی وابستہ ہوگیا۔ ایک طرح سے گھر کا حصہ ہی بن گیا اور ہم مجاور بھی ہوگئے۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ اگر گھر میں کوئی تقریب ہوتی تو باگھ دادا کے مزار کو بھی خوب سجایا سنوارا جاتا۔ اکثر تقریب عرس میں بھی تبدیل ہوجاتی۔ ایسے موقعے پر ہم بچے تمام رات باگھ

دادا کے پاس ہی کھیلتے اور شور مچاتے رہتے۔

پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ نہ جانے کیوں ہمارا گھر اندر ہی اندر ٹوٹنے لگا۔ شاید اس کی وجہ یکے بعد دیگرے کئی حادثوں کا بھی رونما ہونا تھا۔ دراصل سب سے زیادہ لوگ اس وقت ٹوٹ گئے جب جوانی میں ہی میرے ابو کا انتقال ہوگیا۔ انہوں نے گھر سنبھالنے کے لئے بکسر میں نوکری کرلی تھی۔ کچھ حد تک حالات ٹھیک بھی ہونے لگے تھے۔ میری چھوٹی پھوپھی اور چھوٹے ابی کو لے کر وہ اپنے ساتھ گئے تھے۔ میری امی بھی بہت خوش تھیں۔ مگر محض دو برسوں تک ہی وہ نوکری کر پائے اور معمولی سی بیماری کے بہانے ہم سب کو چھوڑ کر چلے گئے۔ پھر پہلے کی طرح گاؤں ہی مسکن بنا۔ اس کے بعد میرے منجھلے دادا کا لمبی بیماری کے بعد انتقال ہوگیا۔ دادا جان ایک دم ٹوٹ گئے۔ چھوٹے ابی بھی گہرے صدمے کی وجہ سے ذہنی توازن کھو چکے تھے۔ گھر میں خاموشی پسرنے لگی۔ غربت نے نئے رنگ بدلے۔ رشتوں کی شدت بھی ختم ہونے لگی۔ ہمارے چھوٹے دادا نے باضابطہ تقسیم کی مانگ کرڈالی۔ کافی شور شرابے اور تناؤ کے بعد آنگن میں دیوار کھڑی ہوگئی۔ ہم بچے بھی الگ ہوگئے۔ اب گلی کی طرف سے ہمارا آنا جانا ہوگیا۔ جب کبھی آنگن میں دوڑنے کی کوشش کرتے تو دیوار زخمی کردیتی۔ مجبوراً گلی میں آکر کھیلنے لگے اور جب کھیلنے کے بعد مفلسی تھک جاتی تو میرے گھر میں ہی رین بسیرا کرتی۔ کبھی قناعت، کبھی صبر، کبھی تحمل کی چادر اوڑھ لیتی۔ ہم سب اس کے ساتھ جینے پر مجبور ہوگئے۔ دادا ابا چاہتے تھے کہ یہ بلا ہماری بیٹیوں اور بچوں کا پیچھا چھوڑ دے۔ مگر وہ تو کچھ اور ہی سوچ کر آئی تھی۔ بس ہر لمحہ امتحان لیا کرتی دادا ابا تمام رات شاید جاگتے ہی رہتے۔ اس لئے کہ جب کبھی پچھلے پہر نیند ٹوٹ جاتی تو پورے گھر میں ان کے وِرد کی آواز دیر تک گونجتی ہوئی محسوس ہوتی۔ سَہِّلْ فَسَہِّلْ یَا اِلٰہِیْ کُلُّ صَعْبٍ بِحُرْمَۃِ سَیِّدِ الْاَبْرَارِ سَہِّلْ ......سَہِّلْ......

ان دعاؤں کا اثر کیا ہوا یہ تو نہیں جانتا لیکن صبح ہوتے ہی دادی اماں کہیں چلی جاتیں۔ تلاش کے بعد پتہ چلتا کہ شاہ مجیب کی اہلیہ انہیں بلاتی ہیں کہ وہ بہت کاریگری کے ساتھ لحاف

دغیرہ سی دیتی ہیں۔ دن بھر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لحاف پر سوئی چلتی رہتی۔ آنکھیں اکثر تھک جاتیں تو دادی اماں اونگھنے لگتیں اور انگلی میں سوئی چبھنے کے بعد اچانک چونک جاتیں۔

پھر ہمارے دور کے امیر رشتہ داروں کے یہاں بھی آنے جانے کا سلسلہ بڑھا۔ چھوٹی پھوپھی کی ہم عمر لڑکیوں میں ان کا جی بھی لگنے لگا۔ وہ دن بھر سلائی کڑھائی کے بہانے روک لی جاتیں۔ مگر پھوپھی کا دل تو گھر میں لگا ہوتا۔ انہیں شدید احساس تھا کہ ہمارے گھر میں لوگ بھوکے ہوں گے۔ بھتیجا تو سب سے زیادہ مایوس ہوگا۔ سچ بھی یہی تھا۔ اب چولہا دن میں شاید ایک بار ہی روشن ہوا کرتا۔ پھر یہ سلسلہ کچھ اور طویل ہوا۔ اسی دوران میرا داخلہ ایک اسکول میں کروادیا گیا۔ امی میرے دونوں چھوٹے بھائیوں کو لے کر میکے جاچکی تھیں۔ دادا ابا نے ہمیں روک لیا تھا۔ گھر میں سب سے زیادہ میرا ہی خیال رکھا جاتا تھا۔ اگر کچھ بھی رزق حاصل ہوتا تو سب سے پہلے مجھے بلاکر کھلایا جاتا۔ مجھے یاد ہے کہ پھوپھی کہیں سے اکثر دوپٹے کی اوٹ میں چھپاکر چاول دال اور سبزی لایا کرتی تھیں۔ ایک طرح سے یہ ان کی اجرت تھی۔ سلائی کڑھائی تو محض ایک بہانہ تھا۔ مگر یہ سلسلہ بھی دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ انا سر اٹھاکر دیکھنے لگی۔ سب کی نگاہیں جھک گئیں۔ جب اسکول میں لنچ کے دوران ایک گھنٹے کی چھٹی ہوتی تو سبھی بچے اپنے اپنے گھر جاکر کھانے کے بعد لوٹتے، مگر مجھے اکثر خالی پیٹ ہی لوٹنا پڑتا۔ مگر کسی کو کبھی پتہ نہیں چلنے دیا۔ ہاں جھوٹ بولنے کی عادت یہیں سے شروع ہوئی۔ کوئی پوچھتا تو بہت اعتماد کے ساتھ کہہ دیتا کہ 'پلاؤ اور گوشت کھاکر آرہا ہوں'

بھوک مگر دن بھر پریشان کرتی رہتی۔ ایک روز میرے دل میں خیال آیا کہ چھوٹی دادی سے جاکر یہ کہہ دوں کی ماڑ مت پھینکئے گا۔ دراصل ماڑ سے زیادہ اس میں جو تھوڑا چاول ہوا کرتا تھا۔ میری دلچسپی اس میں زیادہ تھی۔ جب چھوٹی دادی سے اپنی یہ خواہش ظاہر کی تو وہ مان گئیں۔ بس یہ ضرور وعدہ لے لیا تھا کہ میرے گھر میں کسی سے نہ کہیے گا۔ انھوں نے اپنا وعدہ نبھایا بھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب دیوار مجھے بھلی معلوم ہوئی تھی۔ مگر مجھے کیا پتہ تھا کہ دیواریں واقعی سماعت کی مضبوط ہوا

کرتی ہیں۔ میرے گھر والوں کو معلوم ہو ہی گیا۔ کسی نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ مگر سب شرمندہ ضرور ہوئے تھے۔ بس یہی وجہ تھی کہ میں نے اس وقت چھوٹی دادی کے یہاں جانا چھوڑ دیا تھا۔

اب تو بس ایک ہی سہارا تھا۔ باگھ دادا کا مزار۔ اگر بھوک لگی اور رات میں نیند نہیں آئی تو بار بار جھانک کر دیکھ لیا کرتا کہ ان کے مزار پر کوئی روشنی ہے یا نہیں۔ اگربتی کی خوشبو کا احساس ہوا تو چپکے سے مزار کے سرہانے جا کر ٹٹولنے لگتا۔ کبھی مٹی کے برتن میں ملیدہ مل جاتا اور کبھی وہ جگہ خالی بھی ہوتی۔

آج تیسرا دن تھا۔ سبھی مضمحل تھے۔ مجھے بار بار چھوٹی دادی کے یہاں جانے کے لئے کہا جا رہا تھا، مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ یہاں تک کہ میری پھوپھی نے بھی ان کے گھر کے بچوں کو بلایا اور مجھے ان کے ساتھ جانے کے لئے کہا۔ میں بچوں کے ساتھ گیا لیکن گلی میں دیر تک کھیلتا رہا۔ گھر والوں نے سمجھا کہ بچے مجھے اپنے گھر لے جائیں گے جب انہیں کچھ دیا جائے گا تو کوئی مجھے یونہی نہیں چھوڑ دے گا۔ پتہ نہیں کیوں اس عمر میں ہی مجھے سب سمجھ میں آنے لگا تھا۔ میں کھیلنے کے بعد گھر لوٹ آیا۔ ہاتھ منہ دھو کر لالٹین کی روشنی میں پڑھنے لگا۔ دادا ابا عشاء کی نماز کے بعد لوٹتے اور میرے سر پر ہاتھ ضرور پھیرتے۔ مجھے دم کرتے اور پھر سو جانے کے لئے کہتے۔ اسی وقت اکثر دادی اماں ہماری پھوپھی کو سمجھا رہی ہوتیں کہ دیکھو نماز تو پڑھتی ہو۔ مگر جب دعا مانگو تو اللہ کے سامنے خوب آنسو بہاؤ۔ اسے یہ ادا پسند ہے۔ اس کا بندہ اگر روتا ہے اور رو کر دعائیں کرتا ہے تو اللہ ضرور قبول کرتا ہے۔

اس رات سبھی سو چکے تھے۔ میں نے دھیرے سے دروازہ کھولا۔ زوروں کی بھوک لگی تھی۔ باگھ داد کے مقبرے پر گیا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ میں نے سرہانے ٹٹولنے کی کوشش کی۔ کچھ بھی نہیں ملا۔ دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ دیر تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ میرے دل نے اس وقت باگھ دادا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

'آپ باگھ دادا ہیں۔ آپ نے آدم خور کو مار ڈالا تھا۔ بھوک ہمیں مار رہی ہے کیا آپ اسے نہیں مار سکتے؟' ■

میّا

آج یہ کیا ہوا؟
کیا ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔
چھوٹے چھوٹے خوابوں کی ٹوٹتی بکھرتی تعبیریں۔
امید کے دامن پر بوند بوند آنسو۔
کسی کا دیکھ کر منہ پھیر لینا۔
لمحہ لمحہ ان کے احترام میں جینا اور مرنا۔
......میلوں تک پھیلی ہوئی رسوائیاں لے کر گھر لوٹنے کا یہ کوئی نیا سلسلہ تو نہیں؟

حالانکہ یہ بھی طے ہے کہ کل بھی وہی ہوگا جس کا ڈر ہے یعنی کل بھی تاریخ دہرائی جائے گی۔

آخر خود کو کب تک بہلاؤ گے جعفر امام!
تم وہی ہونا جو بہت آرزوؤں کے بعد دنیا میں آئے تھے۔
تمہارے دس ماہ کے بڑے بھائی نے اپنی اچانک موت کے بعد تمہیں اور اہم بنادیا تھا۔
سب کو ڈر تھا کہ کہیں تم بھی نہ مرجاؤ۔

ایک بار تو ایسا ہوا تھا کہ تم چھ ماہ کے تھے۔ سخت بیمار ہوگئے۔ آنکھیں چھت پر ٹک گئیں۔ پلکوں نے حرکت بند کردی، نبض کہیں ڈوب گئی۔ رات دن چیخنے چلّانے اور پورے گھر کو

اپنا مرکز بنانے والے تم! بالکل خاموش ہو گئے۔ امی نے سوچا تمہارا ابھی وہی حال ہوا۔ ضرور کسی کی نظر نے فنا کر ڈالا۔ سب کے رونے سسکنے کی آوازیں۔ حکیم، ڈاکٹر، دعا تعویذ سب بے سود۔ امی نماز میں اور دھیان میں تم۔ شکر ہے اللہ کو یہ ادا بری نہیں لگی اور ایسے میں گاؤں بھر کی میا آ گئی۔

سب اسے میا کیوں کہتے تھے جب کہ اس کی اپنی کوئی اولاد ماں کہنے کے لئے دنیا میں آئی ہی نہیں۔ وہ میا کیسے بن گئی۔ یہ ایک لمبی داستان ہے۔ ابھی تو صرف یہ بتا پاؤں گا کہ یہ وہ زمانہ تھا جب اس گاؤں میں کسی کے گھر میں بچے کو جنم دینے کے سلسلے میں میا کو ضرور بلایا جاتا تھا۔ وہ کبھی اندر جاتی، کبھی باہر آتی۔ عورت دردِ زہ سے پریشان تو میا کے چہرے پر پسینے کی بوندیں ،مگر اس دوران تناؤ اور گہما گہمی کے بیچ یہ آوازیں ہر کوئی سن سکتا تھا۔ 'لاؤ ذرا گرم پانی۔ دیر ہو رہی ہے۔ لگتا ہے بچہ...... نہیں نہیں کوئی اور بات ہے۔ ارے کوئی پیر صاحب کے یہاں سے پانی پڑھوا کر لاؤ۔ تعویذ بھی لے لینا۔ کمر میں باندھنا پڑے گا۔' کوئی اِدھر دوڑ رہا ہے کوئی اُدھر دوڑ رہا ہے۔ ایسے میں گھر کا کوئی دوسرا بچہ جب زبردستی اس کمرے میں جانے کی ضد کرتا تو میا کی ڈانٹ بھی سنائی دیتی ہے۔ 'ارے کوئی اس کو باہر کرو۔' بچہ کو باہر لا کر کسی کے ذریعہ بہلایا جاتا ہے۔ مگر وہ ہے کہ روئے جاتا ہے۔ ادھر حاملہ کو میا تشفی دیتی رہتی ہے۔ 'بس بیٹی تھوڑا سا اور سہہ لو...... سب ٹھیک ہو جائے گا......' اور کچھ دیر بعد سچ مچ سب ٹھیک ہو جایا کرتا۔ ادھر صبح کی اذان ہو رہی ہے اور ایسے میں کوئی فرشتہ دنیا میں آتا ہے۔ اس کے رونے کی آواز تمام چہروں کو خوشیوں سے بھر جاتی ہے۔ میا دوڑتی ہوئی باہر آتی ہے۔ 'مبارک ہو مبارک ہو۔ بیٹا ہوا چاند سا بیٹا۔'

میا اپنا کام پورا کرنے کے بعد چاہے کوئی بھی موسم ہو، اسی وقت نہا دھو کر شکرانے کی نماز ادا کرتی۔ پھر معمول کے مطابق روز بچے کو تیل لگانا، کاجل ٹیکے کرنا کبھی نہیں بھولتی۔

پچاس برس کی عمر میں اپنے شوہر میر جان کے گزر جانے کے بعد میا ٹوٹ چکی تھی۔ میر جان انتہائی شریف آدمی تھے۔ جب کئی برسوں تک ان کے یہاں کوئی اولاد نہ ہوئی اور جانچ

کے بعد انہیں پتہ چلا کہ اس کی وجہ وہ خود ہی ہیں تو ہمیشہ اس کوشش میں رہے کہ کسی طرح باضابطہ طور پر وہ مکت ہو جائیں۔ میر جان بھواپنی الگ دنیا بسا لے، مگر اس کا اندازہ میر جان بھو یعنی میّا کو ہوا تو نہ صرف دو مہینوں جھگڑتی رہی بلکہ یہاں تک کہہ ڈالا کہ اگر ایسا ہوا تو میں سنکھیا کھا کر ہمیشہ کے لئے سو جاؤں گی، مگر میر جان کی فطری موت نے تو میّا کو ایک دم خاموش کر دیا تھا۔ کئی مہینوں تک بس اپنے گھر کے سامنے میر جان کے لگائے ہوئے نیم کے پیڑ کے سامنے بیٹھی کسی کا انتظار کرتی رہتی۔ اس کی چھوٹی سی دوکان اب اللہ کے بھروسے تھی۔ اسی دوران پڑوس کے بچے میّا سے ضرور قریب ہوئے پھر وہ جگہ دھیرے دھیرے بچوں کی آماجگاہ بن گئی۔ میّا کا دل بہلنے لگا۔ اس نے اپنے جینے کو ایک مقصد عطا کیا۔ بچہ اور زچہ دونوں خوش رہیں۔ حالانکہ لوگوں کا کام ہونے کے بعد کئی بار میّا کا اپمان ہوا۔ اندرونی سطح پر لوگ اسے حاشیے پر ہی رکھنا پسند کرتے تھے، مگر ایک ایسا بھی گھر تھا جہاں اسے سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ یعنی بڑے بابو کا گھر۔ خاندانی لوگ۔ زمین داری مٹ جانے کے باوجود وجاہت باقی تھی۔ میّا فطری طور پر اس گھر میں ایک معزز فرد کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس گھر میں پہنچ کر گاؤں بھر سے ملنے والی رسوائیوں کا درد بھول جاتی تھی بلکہ اسے اپنے ہونے کا خوبصورت مقصد بھی مل جایا کرتا تھا۔ بہتوں کی طرح بڑے بابو کا بھی اس کے دل میں بے حد احترام تھا۔ یہاں تک کہ جب اپنے نیم کے پیڑ کے نیچے بیٹھی ہوتی اور اسے خبر مل جاتی کہ بڑے بابو کے مسجد سے لوٹنے کا وقت ہونے والا ہے تو صرف ان کی آمد کے احساس پر ہی سر پر پلو ڈال لیا کرتی تھی۔ جعفر امام! یہ بڑے بابو تمہارے دادا ابا ہی تھے۔ حالانکہ ان پر بھی غموں کا بوجھ تھا لیکن چہرے کی چمک کبھی کم نہ ہوئی۔ کبھی مضمحل نظر نہ آئے۔ فرصت کے وقت ان کا ایک شغل بھی تھا کہ ہومیو پیتھ کے ذریعہ لوگوں کا علاج کیا کرتے تھے۔ قرب و جوار کے جانے مانے ڈاکٹروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ میّا کو یہ سہولت حاصل تھی کہ اکثر وہ گاؤں کی غریب عورتوں کا دکھ درد سن کر بڑے بابو کے پاس بیان کرتی۔ حال بیان کرنے پر میّا کو دوا دے دی جاتی۔ وہ سمجھا سمجھا کر سب کو ان کی دوائیں دیتے ہوئے کچھ

ہدایت اپنی طرف سے دینا بھی نہیں بھولتی تھی۔ مگر وہ سب سے زیادہ خوش تب ہوا کرتی تھی جب بچے اس کے ارد گرد کھیلا کرتے تھے۔ شور شرابہ، اچھل کود، نوک جھونک۔ پھر اس دوران اس کے نیم کے پیڑ کے نیچے بچے پکی ہوئی نیم کوڑی چنتے ہوئے کوئی چپکے سے پیڑ کی بلندیوں پر بھی پہنچ جاتا تو میّا چلانا شروع کر دیتی۔ 'ٹھہرو...... ٹھہرو۔ ہم آرہے ہیں اوپر۔' اس بیچ کوئی اور دوسری طرف سے پیڑ پر چڑھ گیا۔ کیونکہ بچے جانتے تھے کہ میّا کہاں پیڑ پر چڑھ پائے گی۔ وہ پھر چیختی۔ 'دیکھو نہیں آؤ گے تو سمجھ لو۔ ہم جا کر سب کے گھر میں بول دیں گے۔ آتے ہو کہ بلا دیں بڑے بابو کو......' اور کوئی بچہ جب محبت سے یہ بول دیتا کہ 'آرہا ہوں میّا کچھ نہیں ہوگا۔ آرہا ہوں۔'

بس یہ سن کر تو پگھل جاتی اور پھر بہلا پھسلا کر بچوں کو نیچے اتار کر ہی وہاں سے جایا کرتی تھی۔ ان ہی بچوں میں تم بھی تھے جعفر امام......! اور تمہیں میّا کچھ زیادہ ہی اہمیت دیا کرتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی جب تم بیمار ہو گئے تھے بلکہ مر ہی گئے تھے تو میّا نے آکر سب کو یقین دلایا تھا کہ بابو ایک دم ٹھیک ہو جائیں گے، ہنسنے بولنے لگیں گے، گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر میّا نے سر میں تیل دیا۔ دیر تک سر سہلاتی رہی اور اپنی گود میں لے کر پورے جسم پر تیل مالش بھی کی۔ گھر میں کہرام بدستور جاری تھا۔ میّا نے منع کیا کہ کوئی نہ روئے مگر ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ تیل کا اثر کس حد تک ہوا یہ تو کوئی نہیں جانتا۔ مگر میّا اس رات تمہیں گود میں لے کر اکڑوں بیٹھی رہی۔ رات کی کسی ساعت میں اس نے کہا 'لگتا ہے بابو کی پسلی چل رہی ہے۔!' اس آواز کو سن کر سب لوگ دوڑے ہوئے میّا کے پاس آئے۔ شاید اسے بھرم ہوا تھا مگر اس میں وشواس تھا اور اسی جذبے نے میّا کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ 'اللہ کی جو مرضی ہوگی وہی ہوگا۔ میں بابو کو دو پیسے کے بتاشے پر خریدتی ہوں۔ جی گئے تو میّا کا نصیب اور اگر نہ جیے تو اللہ کی امانت۔'

جعفر امام تمہیں میّا نے محض دو پیسے کے بتاشے پر خریدا تھا۔ اس کی تقدیر سے تمہاری پتھر جیسی آنکھوں میں زندگی لوٹی، پلکیں اِدھر اُدھر ڈولنے لگیں۔ ہاتھوں میں حرکت ہوئی۔ چہرے

پر مسکراہٹ لوٹی۔ میّا نے خدا کا شکر ادا کیا۔ دودھ کا نام ونشان نہ ہونے کے باوجود اس نے اپنی بنجر جیسی چھاتی کھول کر تمہیں دودھ پلانے کی کوشش کی۔ اس کی چھاتی سے ڈھیر ساری ممتا تمہارے وجود میں اتر گئی۔ معمولی سی لگنے والی اس عورت میں کیا کچھ تھا یہ تو تم نہیں جان پائے۔ کیونکہ جب باضابطہ طور پر تم نے ہوش سنبھالا تو میّا گزر چکی تھی۔ ہاں کچھ دھندلی یادیں۔ جیسے نیم کا پیڑ، دھوپ میں کھیلنے پر میّا کی لاٹھی کا لہرانا، اپنی چھوٹی سی دوکان میں رکھے بسکٹ یا گڑ سے بہلانا، گود میں لے کر شادی کا کوئی گیت گانا۔ پیر بابا یا حضرت بی بی کمال کے مزار کی فاتحہ خوانی کا ملیدہ لا کر دینا۔ ایسی کچھ اور دھندلی یادیں ہیں تمہارے ساتھ۔ بچپن میں لوگوں نے بہت کچھ بتایا تھا میّا کے بارے میں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ تم اس کی موت کے بعد اس کے ٹوٹے پھوٹے مکان اور نیم کے پیڑ کو بہت حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔ جب تمہارے ابو بکسر میں رہنے لگے تو تمہیں بھی ان کے ساتھ رہنا پڑا۔ میّا پیچھے چھوٹنے لگی۔ اچانک محض لو لگنے سے بھری جوانی میں تمہارے ابو کا انتقال ہوگیا۔ سب لوگ ایک بار پھر گاؤں میں جمع ہوئے چاروں طرف رونے، چیخنے، پکارنے کی آوازوں سے دور تم میّا کے ٹوٹے ہوئے گھر کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ لوگ کچھ تھمے تو تمہاری تلاش شروع ہوئی۔ تم رو رہے تھے۔ لوگوں نے سمجھا کہ باپ کی موت کا غم ہے بچے کو۔ مگر محض ایسا نہیں تھا دراصل نیم کے پیڑ کا کاٹ دیا جانا اور پھر اس زمین پر کسی مکان کی تعمیر نے بھی تمہیں بہت رلایا تھا۔

اب تم سمجھ گئے ہوگے کہ یادیں اگر پھولوں اور پتوں کی اوٹ میں چھپی ہوتی ہیں تو موسم کے سفاک ہاتھ انہیں نوچ لیتے ہیں۔ اور جب یہاں کامیابی نہیں مل پاتی ہے تو پھر ان کی جڑوں کو ہی اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تم نے سوچا تھا کہ جب نیم کا پیڑ کاٹا جارہا ہوگا تو بچوں کی کلکاریاں دھم دھم زمین پر گر رہی ہوں گی۔ میّا دوڑتی بھاگتی آئی ہوگی۔ چیختے ہوئے اس نے ضرور کہا ہوگا۔ 'ہمیشہ منع کیا۔ پیڑ پر چڑھنے کی کوشش مت کرو۔ مگر ہماری بات کون مانتا ہے؟'

میّا نے بے بس بچوں کی کلکاریوں کو دم توڑتے بھی محسوس کیا ہوگا۔ وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر پائی ہوگی۔ رونے کے سوا۔

جعفر امام! آج اتنے برسوں بعد تمہیں کیا ہوا ہے؟ ذرا سوچو یہ کوئی نئی رسوائی نہیں! نیا غم بھی نہیں ہے۔ محض دو پیسے کے بتاشے پر تمہیں خریدنے والی عورت کسی پیغمبر کی روایت کی امین تھی، جو صرف ماں بن کر رہی۔ تمہارے گھر کے سوا اس نے ہر جگہ رسوائیاں جھیلی تھیں۔ میّا نے تمہیں زندگی عطا کی تھی۔ تم سے جڑی ہر شئے کو بہت عزیز رکھا تھا۔ وقت نے اسے موت دی اور موت نے اس کی رچی بسی دنیا کو بہت بے رحمی سے مسمار کر دیا۔ جس روز وہ نیم کا پیڑ کاٹ کر گرایا جا رہا تھا، دراصل ان ہی لمحوں میں میّا بھی وہیں کہیں دب کر مری تھی۔ اسے روندتے ہوئے کسی کو کوئی ملال نہیں ہوا تھا۔

ذرا سوچو! آج اتنے برسوں بعد جب روز روز کی رسوائیوں سے اوب کر تم بھی مرنا چاہتے ہو تو کیا تمہارے بعد دیر تک کوئی رو بھی پائے گا؟ نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ اب یہاں کچھ نہیں ہوتا۔ تم ان کے مخالف نہیں بن سکتے۔ اور یہ ممکن بھی نہیں کیونکہ یہاں ذمہ داریاں اوڑھی گئی ہیں۔ ایک طرح سے تم بھی دوسروں سے کسی شرط کے بغیر محبت کرتے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی رسوائیاں گھر کے افراد میں منتقل نہیں کرتے۔ بیوی پوچھتی ہے۔ 'کیا ہوا؟ دفتر کی سیاست کا کیا حال ہے؟ فلاں سیاسی شخص نے آپ کی روداد سنی یا نہیں جو آپ کا دشمن بنا بیٹھا ہے، اب وہ کیا کر رہا ہے؟ تم اکثر نہ صرف اپنی حقیقت کو چھپا لیتے ہو بلکہ بیوی کے سامنے اپنی برتری ہی بیان کرتے ہو۔ وہ جھوٹ ہوتا ہے۔ مگر اس جھوٹ سے تمہارے گھر میں کلکاریاں گونجتی ہیں۔ بیوی کے چہرے پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔ ماں دعائیں دیتی ہے۔ بھائی فخر سے سر اونچا کرتے ہیں۔

اور ایسے میں تم تنہا ہوتے ہو تو پھر ایک ایک شخص سے اپنی رسوائی کا بدلہ لیتے ہو۔ دیر تک یہ سوچتے رہتے ہو کہ میں یہ کر رہا ہوں میں وہ کر رہا ہوں۔ انہیں ڈھیر ساری گالیاں دیتے

ہو، کوستے ہو اور کبھی کبھی تو قاتل بھی بن جاتے ہو۔ پھر تمہیں لگتا ہے کہ شاید آج کی لڑائی تم نے جیت لی۔ بیوی رات کا کھانا تمہارے سامنے رکھ دیتی ہے اور اکثر یہ ضرور پوچھتی ہے کہ 'کیا سوچتے رہتے ہو؟'

تم ہنس کر نہ صرف اسے ٹال دیتے ہو بلکہ ماحول بدلنے کے لئے کہہ جاتے ہو کہ 'تمہیں کیا معلوم! ہم صوفی صفت لوگ کس دنیا میں جیتے ہیں۔'

یہ سن کر طنزیہ لہجے میں وہ تمہارے کارنامے بیان کر جاتی ہے اور تم ان سنی کر جاتے ہو۔

اب ایسے میں تمہیں میّا کی یاد آنے لگی ہے تو یہ طے ہو چکا ہے کہ تم نے ایک بڑے بچ کا دامن تھام لیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یادیں لمحہ لمحہ تمہارے اندر نیم کا پیڑ بن کر ابھر رہی ہیں۔ تمہارے ہاتھوں میں ننھی ننھی شاخیں پھوٹ رہی ہیں۔ تم جڑوں کی طرح کچھ دور تک زمین میں دھنس بھی چکے ہو۔ اور اب ایک مکمل درخت بننے کے عمل میں ہو۔ تم کلکاریوں کو زندہ کرنا چاہتے ہو۔ تم اپنی بانہوں پر بچوں کو پھدکتے دیکھنا چاہتے ہو۔ تم چاہتے ہو میّا کی آنکھیں ہمیشہ تمہیں دیکھتی رہیں۔ بیچ بیچ میں وہ تمہیں پکارے۔ بولے 'کھلکھلاؤ میرے بچو! مسکراؤ۔ مہکو فضاؤں میں۔ چمکو سردیوں کی دھوپ میں۔ ٹھنڈی چھاؤں بن کر رہو میری آنکھوں میں میرے بچو......! ■

روگ

غریبی کے علاوہ بچہ کسی اور مہلک بیماری میں مبتلا ہو چکا تھا۔ پانچ سال کی چھوٹی سی عمر اور درد کی شدت کے ساتھ میلوں لمبی رات کا سفر۔ چڑیوں اور دوسرے بچوں کو ہمکتے ہوئے دیکھ کر اسے اور بھی تکلیف ہوتی۔ ماں اس حد تک بے چین کہ اسے کسی طرح اپنے بچے کو ٹھیک کرنے کے لئے جو کچھ بھی کرنا تھا، کر رہی تھی۔ مگر یہ غریبی ایک ایسا روگ ہے کہ لوگ اس کے چھوت کے تصور سے ہی کانپ جاتے ہیں۔ گھر میں ایک جوان بیٹی ہے، مگر وہ بھی کیا کرے۔ اپنے بھائی کے صحت مند ہونے کی دعائیں کرنے کے علاوہ اس کے پاس اور چارہ بھی کیا تھا؟ مگر دعائیں بھی کہاں قبول ہوتی ہیں۔ تھک ہار کر ہم بیٹھ جاتے ہیں، بیٹی اب یہ سوچنے لگی تھی کہ ان کا باپ جب تک زندہ تھا کم از کم سماج میں ہمیں تحفظ ضرور تھا۔ آمدنی بھلے کم تھی۔ اکثر رات میں یوں ہی سو جانا پڑتا تھا۔ بیٹی نے اپنی ماں کو اس لئے باپ کی موت کے لئے موردِ الزام ٹھہرایا تھا کہ دونوں میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر اکثر خوب جھگڑا ہوا کرتا تھا۔ ماں سوچتی تھی کہ وہ نا اہل تھا۔ شادی کے بعد اس نے کبھی سکھی نہیں رکھا۔ فاقہ نے تو جیسے اس کے گھر کو اپنا مسکن ہی بنا لیا تھا۔

مگر ایک روز جب سخت جھگڑے کی وجہ سے ناراض ہو کر وہ باہر گیا تب تناؤ کی وجہ سے بے حد مضمحل تھا۔ ایسے میں سڑک پار کرتے ہوئے کسی تیز لاری کی زد میں آکر دیکھتے ہی دیکھتے مر گیا تو بیٹی ماں کی دشمن ہو گئی۔ بلکہ اکثر وہ ماں کو پیٹ بھی دیا کرتی۔ ماں کو بھی یہ احساس

تھا کہ اس نے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ مگر اب کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ بیٹی روز دھمکی دیتی کہ وہ کہیں بھاگ جائے گی۔ کوئی غلط راہ اختیار کر لے گی۔ ماں اس کے سامنے ہاتھ جوڑتی۔ اپنا گناہ قبول کرتی۔ مگر بیٹی کچھ بھی ماننے کو تیار نہیں تھی۔ باپ نے بھلے ہی بروقت ان کے لئے کھانے کا معقول انتظام نہ کیا ہو۔ مگر اب ماں کو کسی بھی طرح یہ سب کرنا ہی تھا۔ وہ گھر گھر جاتی۔ مدد مانگتی کسی کسی کا کام کردیتی۔ اور پھر گھر میں چولھا روشن ہوا کرتا۔

مگر اس دوران جب اس کا اکلوتا بیٹا سخت بیمار ہوگیا تو بیٹی بھی پریشان ہوگئی۔ بلکہ اس کی بیماری نے ماں اور بیٹی کے رشتے کی دوریوں کو بہت حد تک کم کیا۔ اب گھر میں کھانے کا انتظام ہو یا نہ ہو لیکن اسے ڈاکٹر کو دکھانے اور علاج کروانے میں ہی دلچسپی تھی۔ اپنے پیارے سے بھائی کے لئے بہن نے بھی دوسرے گھروں میں کام کرنے کی خواہش ظاہر کی تو ماں نے سختی سے منع کردیا اور بولی کہ وہ جب تک زندہ رہے گی گھر کا خرچ اور بیٹے کے علاج کے لئے کچھ نہ کچھ کرتی رہے گی۔ بھائی کی لگا تار بیماری نے بہن کو بے حد حساس بنادیا تھا۔ ماں یہ سوچ کر بھی گھر کا بوجھ اپنے شانے پر لے کر چل رہی تھی کہ اگر اس کی وجہ سے شوہر کی موت ہوئی ہے تو اسے جینے کی سزا کاٹنی ہے اور لگا تار محنت سے زیادہ قید بامشقت کیا ہوسکتی ہے۔

بچہ لگا تار بیمار رہا تھا۔ کئی ڈاکٹروں کو دکھایا گیا۔ چار پانچ نسخے لے کر وہ مدد کے لئے بہتوں کے پاس جاتی کیونکہ دوائیں قیمتی تھیں اور لگا تار ان کا استعمال بھی ضروری تھا۔ مگر اس کی خاطر خواہ مدد کسی نے نہیں کی۔

ایک روز وہ تھک ہار کر اپنے بچے کو ایک میلی چادر پر لٹا کر آس پاس سبھی نسخے رکھ دیئے۔ خود برقعہ پہن لیا۔ شاہراہ کے پاس بیٹھی کہ لوگ اسے دیکھ کر ضرور حالات کو سمجھ سکیں گے اور خاطر خواہ مدد مل سکے گی۔ بچہ آنکھیں بند کئے ہوتا۔ ماں ہاتھ پھیلا کر لوگوں سے مدد مانگتی۔ اس نے محسوس کیا یہ عقل اسے پہلے کیوں نہ آئی۔ پہلے دن ہی اتنی رقم ملی کہ نہ صرف بچے کی دوا

آئی اسے انجکشن دیا گیا بلکہ بہت دنوں بعد سبھوں نے سیر ہوکر کھانا بھی کھایا۔

اب یہ معمول ہو چکا تھا۔ جو آمدنی ہوتی اس سے دوا آتی۔ گھر چلایا جاتا۔ مگر ایک ہی شاہراہ کے پاس اسے مہینوں تک جب لوگوں نے دیکھا تو پھر وہ مشکوک ہوگئی۔ لوگوں کا سوچنا غلط بھی نہیں تھا۔ ایسے لوگوں میں مَیں بھی شامل تھا۔ کیونکہ کئی بار فرط جذبات میں اسے میں نے بھی تعاون دیا تھا۔

کچھ دنوں بعد میرے اندر تجسّس پیدا ہوا کہ واقعی بچہ بیمار ہے یا پھر......؟ جرنلسٹ ہونے کے ناطے اب میں نے سوچ لیا کہ اس پر الگ سے ایک اسٹوری کروں گا۔ اسکوپ بھی ہے یہاں۔ حالانکہ بعض افراد نے اپنی سطح پر حکومت کی توجہ بھی مبذول کرائی تھی۔ مگر روایت کے مطابق بے حسی ہی حاوی رہی۔ کوئی اثر نہیں ہوا۔ شاید اسی لئے میں نے سوچا کہ کوئی نہ کوئی نیا پہلو تلاش کیا جائے۔ عورت اپنے بچے کو لے کر اتنے دنوں تک کیسے مدد مانگ سکتی ہے؟

جب میں نے لگاتار اس پر نظر رکھنی شروع کی تو عورت سمجھ گئی اور اس نے جگہ بدل دی۔ مجھے اور دلچسپی ہوئی۔ اب وہ بچے کو لٹا کر جہاں بیٹھنے لگی تھی وہاں سامنے ہی ایک ہوٹل تھا۔ جگہ یوں تو چہل پہل والی نہیں تھی لیکن لوگ وہاں سے ضرور گزرا کرتے تھے۔

جس کا جی چاہا اس نے مدد کردی۔ جب سناٹا ہوجاتا تو بہ ظاہر بے ہوش بچے کو وہ جگاتی۔ دونوں باتیں کرتے۔ بچے کو کچھ کھلاتی اور جیسے ہی کوئی آتا ہوا نظر آتا بچے کو پھر لیٹ جانے کا اشارہ کرتی۔

یہ سلسلہ مہینوں چلتا رہا۔ اس دوران اس کی بیٹی کا رشتہ آیا۔ خوبصورت تھی ساتھ ہی خانہ داری سے بھی بخوبی واقف ہونے کی وجہ سے لوگوں میں ہمدردی کا جذبہ تھا۔ یہ بھی جانتے تھے کہ اس گھر سے کچھ بھی نہیں مل سکتا تھا۔ جس گھر میں عورت کی ضرورت تھی وہاں سے نکاح کا

پروانہ آیا۔ بیچ میں کچھ بزرگ آئے۔ لڑکا درزی تھا۔ خاصا کما لیتا تھا۔ اسے کچھ بھی نہیں چاہئے تھا۔ مگر بیٹی کی شادی ہو اور ماں کچھ نہ کرے یہ بھلا کیسے ممکن تھا۔ سو اس نے کیا بھی۔ مختلف شاہراہوں پر اب پہلے سے زیادہ وقت دینے لگی۔ بچہ کبھی کبھی تھک کر سو جاتا یا پھر رونے لگتا۔ ماں اسے پیار کرتی۔ سمجھاتی۔ بیٹا کچھ اور سہہ لو۔ تمہاری بہن بیاہ دی جائے گی۔ گھر میں نوشے بھائی آئیں گے۔ یعنی داماد کی شکل میں بیٹا آئے گا۔ ہمیں مدد ملے گی۔ بچہ یہ سب تو نہیں سمجھ سکتا تھا لیکن شادی والی بات پر نہ جانے کیوں اس کا من بھی خوش ہو جاتا۔

بے پناہ کوششوں کے بعد بیٹی کی شادی ہوگئی۔ توقع سے زیادہ ہی کیا گیا۔ گھر تنہا ہوگیا۔ بیٹی اپنے گھر میں مصروف ہوگئی۔ ماں بھی گھر سے کم نکلنے لگی مگر بچہ زیادہ بیمار رہنے لگا۔ پھر اسے مدد کی ضرورت ہوئی۔ داماد نے اپنا رنگ دکھایا۔ تعاون تو دور کی بات اسے زبردست شکایت تھی کہ خیرات کے پیسے سے خاطر داری کی گئی۔ بیوی پر میکے جانے کی پابندی لگا دی گئی۔

تھک ہار کر پھر ماں اپنے بچے کو لے کر نکلی۔ اس بار وہ اس جگہ پر آکر بیٹھ گئی۔ جہاں ٹھیک ایک سال پہلے آئی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ شاید اس اطراف کے لوگ بھول چکے ہوں گے کہ وہ مہینوں یہاں پر بیٹھی تھی۔ بچہ سچ مچ اور نحیف ہو چکا تھا۔ لوگ یہ جان کر اس کی مدد کرنے لگے تھے کہ وہ مکمل طور پر بھلے ہی ضرورت مند نہ ہو، لیکن اتنے لمبے وقت تک اگر وہ اپنے بیمار بچے کے ذریعہ پورے پریوار کو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہی ہے تو شاید یہ ایک پہلو ہے جہاں ہم ٹھہر کر کچھ سوچ سکتے ہیں۔

میں نے محسوس کیا کہ اب وہ ہاتھ نہیں پھیلاتی۔ کبھی نقاب اٹھا کر اور کبھی برقعہ میں منہ چھپا کر بس بیٹھی رہتی ہے۔ تھک جاتی ہے تو بچے کو لے کر گھر چلی جاتی ہے۔ اب اس کی آمدنی بہت قلیل ہوگئی تھی۔ اس لئے ضروری دوائیں بھی لینے کے لئے توڑ جوڑ سے کام لینا پڑتا

تھا۔ وہ اپنے بچے کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی بیماری شہنائی کی نذر ہوگئی ہے۔ وہ کرتی بھی تو کیا۔ اس راہ کے سوا سب راہیں مسدود ہو چکی تھیں اور اندھیری رات میں مسلسل ہوا کے دوش پر چراغ بھی کیسے روشن رہ پاتا۔

یہ سلسلہ تو کبھی ٹوٹ جانا تھا۔ سو ایک روز ٹوٹ گیا۔

آج اس نے چادر پر اپنے بچے کو لٹا کر آس پاس ڈاکٹروں کے نسخے نہیں رکھے بلکہ اپنے آنچل سے اس کا منہ ڈھاپ دیا۔ وہ بین کر رہی تھی کہ اس کا بچہ کل رات مر گیا کفن کا انتظام کر دیجئے۔

لوگوں کو اس کی بات پر یقین نہیں ہوا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔ میں نے اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ بچے کی لاش لے کر وہ میرے ساتھ چلنے لگی۔ میں اس کے گھر پہنچا۔ خاطر خواہ مدد کی۔ بچے کو دفنا دیا گیا۔ بیٹی بھی گھنٹے بھر کے لئے سسرال والوں سے چھپ کر آئی اور رو دھو کر چلی گئی۔ کچھ وقفے کے بعد میں نے اسے یقین دلایا کہ وہ اکیلی نہیں ہے۔ میرے گھر آ کر رہے۔ بھرا پُرا پریوار ہے اس کی زندگی مزے سے کٹ جائے گی۔ اس نے حامی بھر لی۔ میں لوٹ آیا۔

بعد میں وہ میرے گھر آئی۔ میں نے اسے اندر بلایا۔ اپنی بیوی، ماں، بہنوں اور بھائیوں سے ملوایا۔ کوئی اس سے مل کر خوش نہیں ہوا۔ سبھی اسے اچھی طرح جانتے تھے بلکہ میرے گھر والوں کا خیال تھا کہ اس نے ہی اپنے بچے کی جان لے لی۔

اس کے جانے کے بعد سبھوں کو سمجھایا۔ کسی طرح راضی کرالیا۔ پھر اسے خود جا کر بلایا۔ دھیرے دھیرے گھر والے بھی اس سے مانوس ہو گئے۔ مگر سب سے زیادہ وہ میرے چار سال کے بیٹے سونو سے قریب ہوگئی۔ ہر وقت اس کا خیال رکھنا، باہر گھمانا، اسکول کے لئے تیار کرنا، واپسی میں اسکول سے لانا، سونو کا جی بھی لگ گیا تھا۔

ایک بار سونو کا اسکول بند ہوا۔ لگ بھگ ایک ماہ کے لئے۔ اس دوران اتفاق سے وہ بیمار ہوگیا۔ علاج کروایا، ٹھیک بھی ہوگیا، لیکن چڑچڑا ضرور ہوگیا۔ وہ اسے بہلاتی رہی۔ کبھی کبھی سونو غصے میں اسے پیٹ بھی دیتا لیکن وہ سب کچھ بہت پیار سے سہہ جاتی۔ بہلانے کے لئے باہر لے جاتی۔ گھومتے گھومتے وہ اس کے کندھے پر سوجاتا۔ وہ گھر میں لاکر اسے بستر پر سلادیتی اور پھر پاس میں خود بھی سوجاتی۔

مگر نہ جانے کیا ہوا کہ ایک روز وہ گھر والوں سے کچھ بولے بغیر بھاگ گئی۔ میں تلاش کرنے کے لئے اس کے گھر بھی گیا مگر پتہ چلا کہ اب وہاں کوئی اور کرائے دار رہنے لگا ہے۔ پھر اس کی بیٹی کے گھر گیا۔ مگر اس نے بھی خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔ بس ٹال گئی۔ سونو بھی اپنے ڈھنگ سے اسے تلاش کرتا رہا۔ پہلے کچھ دنوں تک بہت رویا۔ پھر اسکول کھل گیا۔ وہ کسی طرح بہل گیا اور پھر دھیرے دھیرے ایک طرح سے بھول بھی گیا۔ میں بھی اپنے کاموں میں مصروف ہوگیا۔

ایک عرصے کے بعد میں نے دیکھا کہ کوئی عورت برقعے سے منہ ڈھانپ کر آنے جانے والوں سے بھیک مانگ رہی ہے۔ ٹھیک اسی جگہ پر جہاں بچے کو لے کر وہ عورت بیٹھا کرتی تھی۔ مجھے شک ہوا اور یہ شک یقین میں تبدیل ہوگیا جب میرے سلام کا اس نے جواب دیا، یہ وہی عورت تھی۔

میں نے انتہائی سخت لہجے میں کہا۔ 'کیا ہوا؟ عادت نہیں جائے گی؟ کہا تھا میرے گھر میں رہو۔ کام میں ہاتھ بٹادیا کرو، ٹھیک سے زندگی کٹ جائے گی، لیکن تم......؟

'واہ کیا بات ہے؟ میرے بیمار بچے کو چھوڑ کر آگئی۔ اور وہ بھی کسی سے کچھ کہے بغیر۔ تم لوگ......ہونہہ......!'

پھر میں جانے والا ہی تھا کہ اس نے مجھے روک کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

'نہیں بابو...... ایسا مت سمجھو۔ تمہارے گھر میں رہ کر اچھا لگ رہا تھا۔ ایک بار جب سونو باہر گھومنے کی ضد کرنے لگا تو میں اسے بہلانے کے لئے باہر نکلی۔ کچھ دیر بعد وہ راستے میں ہی میرے کندھے پر سو گیا۔ میں تھک کر ایک جگہ رک گئی تو ایک عورت اپنے بچے کے ساتھ میرے پاس آئی۔ اس نے اپنے بچے کو پانچ روپئے کا سکّہ دے کر مجھے دینے کے لئے کہا۔ ہم تو ایک دم کاٹھ ہو گئے بابو...... تمہارا بچہ میری گود میں تھا اور کوئی مجھے بھیک دے رہا تھا۔ بابو اس روز تو میں بچ گئی۔ کسی اور نے نہیں دیکھا۔ لیکن تم اگر دیکھ لیتے تو نہ جانے کیا ہو جاتا...... ہم کو تو موت ہی آ جاتی۔ یہی سوچ کر کسی سے کچھ بتائے بغیر اپنی جگہ لوٹ آئی......'

یہ سن کر راہ تھم گئی۔ میں اسے بغور دیکھنے لگا۔ پھر یہ محسوس کیا کہ عورت کی پھیلی ہوئی ہتھیلیوں پر میرے لئے دعائیں رکھی ہیں۔ ■

بیج

اس استھی کلش کی داستان بھی عجیب ہے۔

ماں جانتی تھی کہ ایک روز اس کا بیٹا ضرور گاؤں لوٹ کر آئے گا۔ وہ بہت بوڑھی بھی تو نہیں ہوئی تھی۔ مگر نہ جانے کیسے انہوں نے عمر کی کئی منزلیں طے کر لی تھیں۔ چند مزدوروں کے ساتھ جدید تکنیک سے اپنے کھیتوں سے فصل اُگانے کا فن انہیں بخوبی آ گیا تھا۔ اپنے پتی کی موت کے باوجود وہ بہت ٹوٹی نہیں تھیں بلکہ اپنے بیٹے روی کانت کی ننھی انگلیوں کو تھام کر زندگی کو جینے کا ایک مقصد دے چکی تھیں۔ اکلوتے بیٹے کی ہر خواہش کو پورا کرنے کے لئے اکثر زمین بھی بیچ دیا کرتیں۔ ان کے پتی بہت بڑے کاشتکار تھے۔ تا حد نظر پھیلی ہوئی زیادہ تر زمینیں ان کی ہی تھیں۔ اس لئے ماں بھی جانتی تھی کہ اگر تمام عمر بھی ہم ان زمینوں کو بیچتے رہے، شاید تب بھی بدحالی انہیں نہیں چھو سکتی۔ روی کانت کو گاؤں میں رہنے کے باوجود اچھی تعلیم کی طرف مائل کیا۔ میٹرک کے بعد شہر کے بڑے کالج میں داخلہ کروایا۔ لیکن روی کانت کا رشتہ کبھی گاؤں سے ٹوٹا نہیں۔ ماں کی ہدایت کے مطابق وہ کھیتوں میں دلچسپی لیتا رہا۔ اچھی فصلوں کے لئے تگ و دو بھی کرتا رہا۔ ماں خوش ہوتی کہ بیٹا تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود کاشتکاری میں دلچسپی لے رہا ہے۔ روی کانت نے طے بھی کر لیا تھا کہ وہ اپنی زمینوں کو نئی فصلیں اگانے کے لئے تمام تر سہولیات فراہم کرتا رہے گا۔ اور ہوا بھی ایسا ہی۔ کئی بار تو وہ بیرون ممالک بھی گیا۔ اب قرب و جوار کے بڑے کسان بھی بغیر روی کانت سے مشورہ کئے ہوئے کھیتی نہیں کرتے تھے۔ ماں کو

روی کانت پر رشک تھا کہ شاید چہار طرف پھیلے ہوئے گاؤں میں یہ پہلا نوجوان تھا جو شہر کی چمک دمک سے متاثر نہ ہو کر گاؤں کو ہی سجانے سنوارنے میں لگا ہوا تھا۔ سال بھر میں جدید تکنیک کے استعمال سے وہ تین فصلیں اُگا لیا کرتا تھا۔ زیادہ تر اناج یا سبزیوں کو شہر بھیج دیتا تھا۔ اب تو گاؤں کی پکی سڑکوں پر ہمیشہ بیس پچیس لاریاں نظر آیا کرتی تھی۔ آمدنی کا بڑا حصہ وہ بینک میں رکھ دیا کرتا تھا۔ پھر جب اسے ایک روز احساس ہوا کہ کچھ روپے شہر میں اپارٹمنٹ بنانے میں بھی خرچ کر دینے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا بلکہ آمدنی کا ایک اور ٹھوس ذریعہ بھی ہو جائے گا تو ماں سے مشورہ کرنے کے بعد اس نے یہ کام ٹھیکہ داروں کو سونپ دیا۔ اپارٹمنٹ بنا بھی اور آمدنی بھی خاصی ہونے لگی لیکن ایک تبدیلی ضرور آئی کہ روی کانت کا زیادہ تر وقت شہر میں گزرنے لگا۔

دھیرے دھیرے جدید تکنیک کے استعمال کے باوجود خاطر خواہ فصل نہ ہونے کی وجہ سے ماں فکر مند ہو گئی۔ روی کانت اپارٹمنٹ میں الجھتے جا رہے تھے۔ کبھی ٹھیکہ داروں سے، کبھی انجینئروں سے اور کبھی...... ایک طرح سے ان پر جنون طاری ہو گیا تھا کہ وہ گاؤں کے باقی کھیتوں کو بیچ کر بھی اب صرف اپارٹمنٹ ہی بنوائیں گے۔ کیونکہ فصلوں کے ساتھ موسم کا بھی دخل ہوتا ہے اور پھر محنت بھی زیادہ کرنی پڑتی ہے۔ ٹھیکہ داروں نے بھی انہیں یہی مشورہ دیا تھا کہ شہر میں یہ کام کر کے انہیں زیادہ الجھنوں کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ ایک بار اپارٹمنٹ بن گیا تو لگ بھگ سو برس کی فرصت۔ اب تو روی کانت نے ایک خوبصورت کار بھی خرید لی تھی۔ شہر کے جانے مانے تاجروں میں ان کا شمار ہونے لگا تھا۔ گاؤں تو آنا کم ہی ہو گیا تھا لیکن جب بھی آتے ماں سے جھگڑا بھی کر لیتے اور بقیہ کھیتوں کو بیچنے کا مشورہ دیتے۔ ماں جب ایسا کرنے سے انکار کرتی تو وہ رشتہ توڑ دینے تک کی دھمکی دیتے۔ ماں کی بس ایک ہی کمزوری تھی روی کانت۔ اور شاید اسی لئے وہ زیادہ تر روی کانت کی باتوں کو مان بھی لیا کرتیں۔ اب وہ شہر

میں نئے نئے اپارٹمنٹ بنانے میں ہی روپیہ صرف کرنے کو اولیت دے کر لگ بھگ گاؤں کو بھول ہی چکے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ماں بھی شہر ہی میں ان کے ساتھ رہے۔ ماں نے یہ ضد نہیں مانی تھی اور کھیت کا وہ بڑا پلاٹ بھی بچالیا تھا جو انہیں بے حد عزیز تھا۔ ماں بہت بیمار رہنے لگی تو ایک روز روی کانت پوری سینا کے ساتھ گاؤں آئے۔ بہت کوشش کی کہ وہ ماں کا علاج شہر لے جا کر کرائیں لیکن وہ تیار نہیں ہوئیں۔ یہاں تک کہ روی کانت نے ایک بار پھر رشتہ توڑنے کی دھمکی دی۔ ماں پر اس کا بھی کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا۔ اس بار وہ صرف مسکرا کر رہ گئیں۔ روی کانت پر تو جیسے جنون طاری ہو چکا تھا۔ وہ غصے میں اس طرح برہم ہوئے کہ اوروں کے بہت منانے کے باوجود اپنے کارندوں کے ساتھ شہر چلے گئے۔ ماں کو اس روز بہت احساس ہوا لیکن انہیں یقین تھا کہ روی کانت ایک روز ضرور ان کے پاس آئے گا۔ وہ بہت دنوں تک نہیں لوٹے۔ ماں کو ان کی خیریت ملتی رہی۔ بعد میں ہوا یوں کہ روی کانت بہت مصروف ہو گئے۔ اب ان کا زیادہ تر وقت مقدمے اور عدالتوں میں گزرنے لگا۔ دھمکیوں بھرے خطوط اور ٹیلی فون سے بھی خاصے پریشان رہنے لگے۔ شہر کے دوسرے کاروباری روی کانت کی کامیابیوں سے بہت خائف تھے۔ شہر کا بڑا کنٹریکٹ بھی انہیں ہی ملنے لگا تھا۔ کئی بار قاتلانہ حملے بھی ہوئے، لیکن یہ سب خبر انہوں نے ماں تک نہیں پہنچنے دی۔ کبھی کبھی روی کانت جب سخت الجھنوں میں ہوتے تو ماں بہت یاد آتی۔ انہیں سخت تعجب تھا کہ وہ انہیں منانے کی کوشش کیوں نہیں کر رہی ہیں۔ پھر ایک روز تھک ہار کر انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ماں سے معافی مانگ لیں گے۔ وہ خوش ہو جائے گی۔ پہلے کی طرح تین چار بار گاؤں بھی جایا کریں گے اور ماں کی خواہش کے مطابق گاؤں سے ہی شادی کریں گے۔

ان ہی جذبوں کو سمیٹے ہوئے وہ صبح پانچ بجے ہی جگ گئے۔ باتھ روم گئے۔ پوری تیاری کے بعد ڈرائیور کو بلوایا۔ گاڑی نکالنے کو کہا۔ بولے آج گاؤں جائیں گے۔ ڈرائیور نے

حکم کی تعمیل کی۔ صبح کی پر کیف ہواؤں سے محظوظ ہوتے ہوئے وہ کچھ گنگنانے بھی لگے۔ پھر سوچنے لگے کہ ماں اچانک انہیں دیکھ کر بہت خوش ہو جائے گی۔ اسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے کہ محسوس ہوا کہ ڈرائیور نے راہ بدل لی ہے۔ چونک کر پوچھنے لگے کہ آج ایسا کیوں کر رہے ہو؟ پہاڑی کی طرف سے جانے پر تو گاؤں شام سے پہلے نہیں پہنچ سکتا۔ ڈرائیور خاموش رہا۔ انہوں نے ڈانٹ کر اسے گاڑی روکنے کے لئے کہا۔ ڈرائیور پھر بھی تیزی سے گاڑی چلاتا ہی رہا اور جب روی کانت اچھل کر اگلی سیٹ پر آ گئے تو ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ سامنے گہری کھائی تھی اور چاروں طرف ایک عجیب سی خاموشی۔ چند قدم اور جانے پر گاڑی نہ جانے کتنی دور گہرائیوں میں چلی جاتی۔ ابھی روی کانت ڈرائیور سے کچھ اور بولنا ہی چاہ رہے تھے کہ اچانک ایک گاڑی ان کے پاس آ کر رک گئی۔ وہ گیٹ کھولنے ہی والے تھے مگر پاس والی کار سے ایک نقاب پوش برآمد ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے روی کانت کا سارا جسم گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ ڈرائیور جب تک دروازہ کھول کر باہر آ چکا تھا۔ روی کانت کچھ ہی لمحوں میں ایک دم سرد ہو گئے۔

ڈرائیور مسکرانے لگا اور اس نے قاتل سے کہا۔ 'صاحب میں نے آپ کا کام کر دیا'

'نہیں ابھی کام پورا نہیں ہوا ہے۔ اس گاڑی کو اس گہری کھائی میں ڈھکیل دو'

پھر ڈرائیور نے قاتل کی مدد سے ایسا ہی کیا۔ روی کانت کی لاش کے ساتھ گاڑی گہری کھائی میں جا گری اور پھر زوردار دھماکہ کے ساتھ کچھ دیر تک شعلے بھی اگلتی رہی۔

قاتل اپنے سب سے بڑے کاروباری حریف کو قتل کرنے کے بعد بے حد خوش ہوا۔ ڈرائیور بھی اپنی کامیابی پر بہت خوش ہوتا ہے اور پھر وعدے کے مطابق انعام کی درخواست کرتا ہے تو قاتل اسے اپنے پاس بلاتا ہے اور بطور انعام اسے باقی گولیوں سے بھون دیتا ہے اور پھر بمشکل اس لاش کو بھی گہرائیوں کے حوالے کر دیتا ہے۔

روی کانت کے قتل کی خبر جب ماں کو دی گئی تو پہلے ان پر زبردست سکتہ طاری ہو گیا مگر چند دنوں بعد ہی وہ ایک دم نارمل ہو گئیں۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ یہ خبر جھوٹی تھی۔ کیونکہ بہت کوششوں کے بعد بھی لاش حاصل نہیں کی جا سکی تھی۔

گاؤں والے چاہتے تھے کہ ماں جی ایک بار بھی جی بھر کر رو لیں۔ لیکن تمام تر کوششیں ناکام ہو گئیں۔ وہ مسلسل کاشتکاری کرواتی رہیں۔ جب کوئی کسی بھی طرح روی کانت کی موت کی بات دہراتا تو وہ اس قدر برہم ہو جاتیں کہ لوگ خوفزدہ ہو کر وہاں سے ہٹ جاتے۔

ہفتوں کی کوششوں کے بعد روی کانت کی لاش کی شناخت ہوئی لیکن لاش اس طرح جل چکی تھی کہ تن کا کچھ حصہ ہی کہیں کہیں دور پہاڑ کی گہرائی میں ملا تھا۔ روی کانت کے جلے ہوئے ہاتھوں کی انگوٹھیوں اور پھٹی قمیض کی جیب میں جلے ہوئے کچھ کاغذات سے شناخت ہوئی تھی کہ یہ روی کانت کی ہی لاش ہے۔ جسم کے جو اعضا بھی ملے ان کی جانچ کے بعد رشتہ داروں نے کسی طرح انتم سنسکار کروایا۔ ماں کے بارے میں یہ مشہور ہو چکا تھا کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو چکی ہیں۔ پھر بھی ایک رشتہ دار استھی کلش لے کر ان کے دروازے پر پہنچا۔ اس نے بہ مشکل کہا۔

'روی بابو گاؤں لوٹ آئے ہیں۔ اب انہیں چھما کر دیجیے۔'

استھی کلش کو دیکھ کر ماں خلاف توقع برہم نہیں ہوئی، روئی بھی نہیں۔ ہاں اسے اپنے ہاتھوں سے چھوا ضرور بلکہ اپنی گود میں رکھ کر بیٹھ گئیں۔ گاؤں والوں کو لگا کہ اب ماں جی ضرور رو دیں گی لیکن ماں جی نہ جانے کیا سوچ رہی تھیں۔ پھر انہوں نے سب کی طرف باری باری دیکھا اور پھر استھی کلش کو بہت سنبھال کر روی کانت کے سجے سنورے ہوئے کمرے میں لے گئیں۔ روی کانت کے بستر پر اسے اس طرح رکھا جیسے وہ اس کو اب تھپکیاں دینا چاہتی ہوں۔ پھر کچھ سوچ کر بیٹے کی ایک بڑی تصویر لائی، اسے استھی کلش کے پاس رکھا پوجا گھر سے اگربتی لا کر

جلائی۔ کمرہ خوشبوؤں سے بھر گیا۔ محلے کی کچھ عورتیں بھی اس کمرے میں داخل ہو چکی تھیں۔ ماں ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھ گئی۔ دوسری عورتیں سسکیوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد عورتیں چلی گئیں تو ماں تنہا اپنے بیٹے کے ساتھ رہ گئی۔ وہ ایک ٹک استھی کلش کو دیکھ رہی تھیں۔ انہیں محسوس ہوا کہ اپنی ننھی انگلیوں کو اچانک روی کانت نے ان کے کندھے پر رکھ دیا ہے۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولنے کی کوشش کر رہا ہے۔

'ماں بہت رات ہوگئی ہے۔ مجھے نیند آرہی ہے۔'

ماں ننھے روی کانت کو اپنی گود میں سر رکھ کر سو جانے کے لئے کہتی ہیں اور پھر تھپکیاں دینے لگتی ہیں۔ یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہتا ہے۔ ماں روی کانت کے ساتھ خود بھی سو جاتی ہیں۔

سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی پھر محلے کی عورتیں کمرے میں جمع ہو گئیں۔ ماں کی آنکھیں بند دیکھ کر سبھوں کو تشویش ہوئی۔ ایک عورت نے انہیں آہستہ سے کہا۔

'ماں جی صبح ہوگئی ہے۔'

ماں چونک جاتی ہیں۔ ان کی آنکھیں کمرے میں چاروں طرف کچھ تلاش کرتی نظر آتی ہیں۔ پھر وہ دھیرے دھیرے اٹھ کر استھی کلش کے پاس جاتی ہیں۔ اسے اٹھا کر اپنی ہتھیلیوں پر رکھتی ہیں۔ عورتیں سسک اٹھتی ہیں۔ ان کا اس طرح غمزدہ ہونا ماں کو اچھا نہیں لگا اور وہ خود کو روک نہیں پائیں، بولنے لگیں۔

'تم لوگ اس طرح سوگ مت مناؤ۔ ماں کا دل ہے! میں تم سے زیادہ رو سکتی ہوں۔ آؤ میرے ساتھ آؤ۔'

ماں استھی کلش کے ساتھ دھیرے دھیرے بڑھنے لگیں۔ وہ گھر سے باہر نکل جاتی

ہیں۔ گاؤں والے ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ کئی راہوں سے گزرتے ہوئے ماں دور تک پھیلی ہوئی اپنی اس زمین پر آکر کھڑی ہوگئیں جو انہیں بہت عزیز تھی۔ پھر اتھی کلش سے راکھ نکال کر اپنے ہاتھوں سے ہر طرف اسے بکھیرنے لگیں۔اس کے بعد پاس والی ندی کے پاس جاکر اس خالی کلش کو پانی میں دفن کر دیا اور بہت بوجھل قدموں کے ساتھ اپنے گھر لوٹ آئیں۔

گاؤں والے ماں جی کا بہت خیال رکھ رہے تھے۔ اب تک ایسا کچھ نہیں ہوا تھا، جس کا انہیں ڈر تھا۔ ماں جی ایک دم ٹھیک تھیں۔ روز کی طرح پوجا پاٹھ۔ جدید تکنیک کے تحت کھیتی کروانا، سبھی مزدوروں کو وقت پر اجرت دینا۔کوئی پریشان کرتا تو دیر تک تکرار بھی کرلیتیں۔ ہاں یہ ضرور ہوا تھا کہ جس کھیت کو اپنے بیٹے روی کانت کو سونپ چکی تھیں۔ اس میں جدید تکنیک کا استعمال نہیں کرنے دیتی تھیں۔ بس روایتی ڈھنگ سے ہی اس میں بیج ڈالنے کی اجازت تھی۔ اگر کوئی اس کی ننھی ننھی فصلوں کو کہیں سے بھی روند جاتا تو وہ کئی دنوں تک اس پر برہم ہوتی رہتیں۔

پھر ایک روز ایسا ہوا کہ اس کھیت پر ہریالی چھا گئی۔ سبھوں کو سخت تعجب ہوا کہ جن کھیتوں میں ہر تکنیک کا استعمال کیا گیا تھا وہاں اس بار فصل اچھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن جہاں روی کانت کی راکھ تھی وہاں تو جیسے ایک معجزہ ہوگیا تھا۔

ماں بھی شاید ایسا ہی سوچ رہی تھی۔ جب اس کھیت کی فصل ایک دم لہلہا اٹھی تو ماں دوڑتی ہوئی گاؤں کی گلیوں میں گئیں۔ ہر دروازے پر جاکر سبھوں کو کھیت کی طرف آنے کے لئے کہا۔

کچھ دیر بعد بھیڑ اس جگہ جمع ہوگئی۔ ماں چلاّ چلاّ کر کہہ رہی تھیں۔ 'دیکھو روی کانت لوٹ آیا ہے۔ مجھے وشواش تھا کہ وہ ایک دن ضرور لوٹے گا۔'

ماں تو واقعی بہت خوش تھیں لیکن خوش ہوتے ہوئے اس طرح چہرہ آنسوؤں سے نہیں بھیگ جاتا۔ ■

جڑیں

شیتل پور گاؤں کے باہر پیپل کا ایک بڑا درخت ہے۔ اس کی بانہیں دور دور تک پھیلی ہیں اسی درخت کے نیچے ایک چبوترہ ہے، جس پر بیٹھ کر کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ پنچایت کے فیصلے ہوا کرتے ہیں۔ بچے کھیلتے بھی ہیں۔ اس کی جڑوں میں پوجا کے تازہ پھول بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہاں چاروں طرف دھاگے بھی لپٹے ہوئے ملیں گے۔ جڑوں میں رکھے ہوئے تازہ پھولوں یا چاروں طرف لپٹے ہوئے دھاگوں کو بچے نہ چھوتے نہ چھیڑتے ہیں۔

اسی درخت کو لے کر شیتل پور گاؤں کے ایک گھر میں زبردست تناؤ ہے۔ اور وہ گھر ہے شیخ رمضانی میاں کا۔ شیخ رمضانی پینسٹھ کے ہو چکے ہیں۔ ان کے دو بیٹے ہیں۔ شیخ کلیم اور شیخ سلیم۔ دونوں کی شادی ہو چکی ہے۔ کھیتی کے علاوہ قرآن و حدیث کا مطالعہ اور گاؤں کے اکلوتے مولوی صاحب کی تقریر سننے میں ان کی خاص دلچسپی ہے۔

ابھی جو اس گھر میں تناؤ ہے، اس سے شیخ رمضانی کے علاوہ ان کی بیوی اور شیخ رمضانی کا سات سالہ پوتا مُنّو بہت پریشان ہیں اب تو روز صبح و شام پہاڑ ٹوٹتا ہے۔ مُنّو کچھ سمجھ نہیں پاتا تو رونے لگتا ہے۔ شیخ رمضانی غصے سے بھر جاتے ہیں تو اسی پیپل کے نیچے جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔

کھلیان سے لوٹنے پر آج پھر دونوں بیٹے، باپ پر بھڑ رہے ہیں۔

'ابا! اب اور حاتم طائی نہ بنئے۔ کچھ روز بعد بھوکے رہنے کی نوبت آنے والی ہے۔'

'ان کی کیا ہے؟ یہ تو آج ہیں کل گزر جائیں گے۔ سارا دکھ تو ہم لوگوں کو ہی جھیلنا ہے۔'

'ہم ایک بار پھر آپ سے کہہ رہے ہیں کہ اب اور نہیں جھیلیں گے، جو فیصلہ کرنا ہے جلد ہی کر دیجئے۔'

شیخ رمضانی نے دونوں کی جلی کٹی باتیں سن کر لگ بھگ چیخ کر کہا...... 'اب کیا چاہتے ہو تم لوگ۔ رہی سہی عزت کو بھی مٹی میں ملا دیں؟ ارے تم لوگوں نے کیا دیکھا ہے؟ کیا کیا دکھ نہیں جھیلا ہے ہم نے۔ تین تین دن بھوکے رہے ہیں۔ تم لوگ سمجھتے ہو کہ آج جس کھیت پر راج کر رہے ہو، آسانی سے مل گیا ہے؟ خون پسینہ ایک کیا ہے ہم نے۔'

تبھی شیخ سلیم کی بیوی ٹپک پڑی۔

'ای بات آپ بار بار مت بولئے ابا۔ اس میں احسان کا ہے کا۔ کون باپ اپنے بچوں کے لئے نہیں کرتا ہے آپ ہی دنیا میں اکیلے تو نہیں ہیں۔'

شیخ سلیم نے بیوی کی بات کو اور آگے بڑھاتے ہوئے کہا...... 'کوئی گھر ایسا نہیں ہوگا۔ ہم اب بار بار یہ سب نہیں سنیں گے۔ ہم لوگوں کو الگ کر دیجئے، دن بھر محنت کرو، تب بھی چین نہیں ہے۔'

اب شیخ رمضانی نے بیٹے کو بہت نرم لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی...... 'بیٹا سب کچھ تم ہی دونوں کا ہے۔ ہم کیا یہاں سے لے کر جائیں گے؟ تم کو کھیتی کے لئے زمین کم لگتی ہے تو پوکھر کے پاس والی زمین کا ہے نہیں جوتنے کی کوشش کرتے ہو۔'

شیخ کلیم نے کہا...... 'دیکھئے ابا! یہ بات آپ کے ساتھ سارا گاؤں جانتا ہے کہ پوکھر کے پاس والی ہم لوگوں کی جو زمین ہے، ایک دم بنجر ہے۔ ایک بار آپ بھی بولے تھے کہ اس میں کنکر پتھر بہت ہے۔ ہل تک ٹوٹ چکا ہے۔'

'بیٹا یہ تب کی بات تھی جب میں اکیلے کام کیا کرتا تھا۔ کوئی بھی نہیں تھا میرے ساتھ۔ اب تم دونوں ہو۔ چاہو تو اور مزدور بھی رکھ سکتے ہو۔'

شیخ سلیم کی بیوی پھر ٹپکی......'اب ای سب ڈھکوسلا آپ ہی کیجئے۔ ہم لوگوں سے ای سب نہیں ہوگا۔'

'دلہن! تم بیچ میں کاہے کو بولنے لگتی ہو۔'

'کاہے نہیں بولیں؟ تکلیف ہم بھی سہتے ہیں اور پھر روز روز کا بک بک ہم کو بھی اچھا نہیں لگتا ہے۔'

اب منّو سے بھی نہیں رہا گیا تو اس نے بول دیا......'چپ بھی رہو اماں۔'

منّو کا اتنا بولنا تھا کہ شیخ سلیم نے سارا غصہ اس پر اتار دیا۔ جب اسے کئی تھپڑ رسید کر چکا تو زبردستی شیخ رمضانی نے اسے چھڑا دیا اور روتے ہوئے منّو کا ہاتھ تھام کر گھر سے باہر نکل گئے۔ دونوں درخت کے نیچے آ کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد منّو سسکتے ہوئے اپنے دادا جی کی گود میں سر رکھ کر سو گیا۔

اس تناؤ کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شیخ رمضانی جس درخت کے نیچے آ کر بیٹھے ہیں اسے آج سے چالیس سال پہلے انہوں نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔ جب اپنے کھیت سے وہ یہ پودا لے کر چلے تھے تو ان کے دوست نتھنی رام نے کہا تھا کہ پیپل کا پودا کاہے کو لگا رہے ہو۔ آم کا پودا ہوتا تو پھل بھی ملتا۔ تب شیخ رمضانی بولے تھے کہ پیپل کا پیڑ مجھے بھلا لگتا ہے۔ یہ بہت دنوں تک ٹکتا بھی ہے۔ اس کے پتوں میں جو بات ہے وہ کسی اور میں کہاں؟ اور انہوں نے یہ بھی چاہا تھا کہ یہ پودا درخت بن جائے تو اس کی شیتل چھایا بھی ہوگی۔ بعد میں اس کے نیچے ایک چبوترہ بنوانے کا بھی پلان تھا کہ لوگ شام سویرے بیٹھ سکیں گے۔ کچھ قصہ کہانی ہوتا کہ دل بھی بہل جائے۔

جہاں شیخ رمضانی نے پودا لگایا تھا وہ ان کی اپنی زمین تھی۔ پودا دھیرے دھیرے پھیلتا گیا اور پھر شیخ رمضانی کے لگ بھگ بیس کٹھے کے اس پلاٹ پر درخت بن کر بانہیں پسار کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے اس کے بیچ میں چبوترہ بنوایا۔ وہاں پنچایت بھی ہوتی، بچے کھیلتے، لوگ قصے

کہانیاں سنتے۔ دھیرے دھیرے آس پاس کے گاؤں والے لوگ اس درخت کی جڑوں میں بیٹھ کر پوجا پاٹ بھی کرنے لگے۔ لوگوں کی منتیں بھی پوری ہونے لگیں۔ لیکن پوجا کرنے والے لوگ صرف صبح میں ہی دیکھے جاتے تھے۔

شیخ رمضانی کے بیٹوں کے نظریے سے یہ زمین بہت اپجاؤ تھی اور ان کا ایسا سوچنا غلط بھی نہیں تھا کہ قانونی طور پر زمین ان کی ہی تھی۔ وہ جب چاہتے جوت سکتے تھے، لیکن شیخ رمضانی ان کی پوری طرح سے مخالفت کررہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ برسوں پہلے انہوں نے جس درخت کی کلپنا کی تھی اور وہ درخت جس روپ میں ابھر کر ان کے سامنے آیا تھا، اسے بیٹوں کی ضد کے آگے قربان کردیں۔ انہیں بیٹوں کے رویّوں کو دیکھ کر محسوس ہو چکا تھا کہ ان کے بعد یہ درخت یونہی بانہیں پھیلائے نہیں رہ سکتا۔ شاید اسی لئے انہوں نے اپنی سطح پر اس کی حفاظت کا انتظام کردیا تھا۔ پھر بھی ان پر اداسی چھائی رہتی تھی۔

آج اپنے دل کی بات انہوں نے اپنے بچپن کے دوست نتھنی رام سے کہی۔

'کیا کہتے ہو نتھنی۔ اب تو ہم لوگ کسی بھی روز گزر جائیں گے۔'

'کیا کروگے، یہ تو ہوتا ہی ہے رمضانی میاں۔' نتھنی نے دور کھیتوں کو تکتے ہوئے کہا۔

'نتھنی مجھے ایک چنتا ہے کہ اگر میں نہیں رہا تو ہوسکتا ہے یہاں پر چوپال نہ ہو، یہ درخت بھی نہ رہے، کوئی کہانی کہنے والا بھی نہیں آئے۔ پوجا کرنے والوں کو بھی دوسرا درخت تلاش کرنا ہوگا۔'

نتھنی نے غور سے رمضانی میاں کو دیکھا۔ 'ای تم کا بکے جا رہے ہو؟'

'نتھنی! میرے بیٹوں نے مجھے بہت پریشان کررکھا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ چین سے مرنے بھی نہیں دیں گے۔ کہتے ہیں کہ اس زمین کو جوت ڈالوں۔ بولو ایسا کیسے ہوسکتا تھا؟ اس لئے میں نے بہت سوچ وچار کر اپنی یہ زمین گاؤں کی پنچایت کے نام کرتے ہوئے وصیت

کردی ہے کہ اس درخت کو جیسے بھی ہو بچایا جائے، چوپال یہیں ہوتی رہے۔ شام میں گاؤں کے بچے یہاں پر کھیلا کریں۔ اپنے لئے صرف یہ وصیت کی ہے کہ جہاں اس درخت کی شاخیں زمین کو چھونے کی کوشش کر رہی ہیں وہیں کہیں میرے مرنے کے بعد مجھے دفنایا جائے، میری قبر بنائی جائے، لیکن کبھی اس پر گارا یا سیمنٹ ڈال کر پختہ کرنے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ دھیرے دھیرے اسے زمین کی سطح بننے دیا جائے۔'

نتھنی رام یہ سن کر سناٹے میں آگئے۔ پھر انہوں نے غور سے رمضانی کو دیکھا۔ دیر تک دیکھتے ہی رہے۔ ان کے اندر بھاونائیں تو بہت ابل رہی تھیں لیکن شبد ان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ جب کچھ بھی نہیں کہہ پائے تو زور سے شیخ رمضانی کا ہاتھ تھام لیا۔

دوسرے روز شیخ رمضانی کئی مزدوروں کے ساتھ پوکھر کے پاس والی اپنی بنجر زمین کو کھودنے کی کوشش میں لگے تھے۔ گھر میں بیٹے انہیں پاگل سمجھ رہے تھے لیکن شیخ رمضانی کا پوتا مُنّو ان کے کام میں ہاتھ بٹاتا ہوا نظر آیا۔ کئی دنوں پھر کئی مہینوں کی محنت کے بعد ایک روز ایسا ہوا کہ اس بنجر زمین پر بھرپور فصل ہوئی۔ اناج کھلیان میں لے جایا گیا تو شیخ رمضانی کے بیٹوں کو یقین نہیں ہوا کہ اچانک ہم اتنے خوشحال کیسے ہو گئے۔ اس روز برسوں بعد دونوں بہت خوش نظر آئے۔ گھر لوٹے تو پتہ چلا کہ ابا گھر میں نہیں ہیں۔ دونوں بیٹے ابا کو تلاش کرنے کے لئے نکلے تو دور سے پیپل کے گھنے درخت کے نیچے چبوترے پر لیٹے ہوئے نظر آئے۔ انہیں قریب سے دیکھنے پر ایسا محسوس ہوا تھا کہ دنیا کی ہر فکر سے بے خبر ہو کر بہت سکون کے ساتھ سو رہے ہیں۔

بیٹے وہاں پہنچنے کے بعد ابا کو چین سے سوتا ہوا دیکھ کر پاس میں بیٹھ گئے۔ انہیں جگانے کی کوشش نہیں کی لیکن جب اندھیرا اور گھنا ہو گیا تو دوڑتا ہوا مُنّو درخت کے نیچے آیا اور اپنے دادا جی کو جگانے کی بہت کوشش کی لیکن شیخ رمضانی پورے طور پر سرد ہو چکے تھے۔

بیٹوں پر سکتہ طاری ہو گیا کہ انہوں نے اچانک اس عظیم ترین سانحے کے بارے میں

سوچا بھی نہیں تھا۔ مذہبی کتابوں کے حوالے سے ہزاروں پیغمبروں کے بارے میں سنا تھا، ان کے پیغامات پر ایمان بھی لا چکے تھے لیکن کیا یہ ممکن تھا کہ کسی بے حد معمولی کسان کے گھر اور جو بظاہر روایتی انداز سے اپنے خالق کی عبادت میں بھی کبھی مشغول نہیں پایا گیا ہو۔ جس نے اپنی چھوٹی سی کائنات کے انسانوں میں ہی سب کچھ تلاش کرلیا ہو، جس نے اپنے جینے کے انداز سے ہزاروں صحت مند تبدیلیاں لائی ہوں اور اس عالم سے صرف شیخ رمضانی ولد شیخ ربانی بن کر اٹھ گیا ہو۔ کیا ایسے انسان کے گھر پیغمبر کی رسم لوٹ آنے کی بات پر کوئی یقین کرسکتا ہے؟ لیکن یہ تو طے ہے کہ آج جو درخت دور تک شیخ رمضانی کی دی ہوئی زمین پر بانہیں پھیلا کر کھڑا ہے اور جس کی جڑیں نہ جانے کہاں کہاں تک پھیل چکی ہیں۔ شاید کوئی چاہ کر اسے نہیں مٹا سکتا۔ یہی سوچ کر سچ مچ دونوں پورے طور پر بھیگ چکے تھے۔ ساری رات انہوں نے روتے ہوئے کیسے گزار دی اس کا احساس تک نہیں ہوسکا۔ جہاں درخت کی بانہیں زمین پر جھکی تھیں بیٹوں نے وصیت کے مطابق شیخ رمضانی کو وہیں پر دفنایا تھا۔

پھر درخت کے نیچے سب کچھ پہلے جیسا ہونے لگا۔ اب عقیدت بھی بڑھی تھی۔ سبھوں کو وشواس تھا کہ شیخ رمضانی بابا انہیں دیکھ رہے ہیں۔

کئی مہینے گزر گئے۔ ایک روز منّو اسی درخت کے نیچے کھیل رہا تھا کہ اس نے دیکھا، دادا جی کی قبر کی مٹی سے ایک چھوٹا سا پیپل کا پودا اُگا ہے۔ وہ دوڑتا ہوا اس جگہ پر گیا۔ اپنی طرح ایک دم معصوم سے پیپل کے چھوٹے چھوٹے پتوں کو اپنے ننھے ہاتھوں سے دیر تک چھو کر دیکھتا رہا۔ تھوڑی مٹی لے کر پودے کی حد بندی کی اور پھر پاس کے تالاب سے تھوڑا سا پانی لا کر اس کی جڑوں میں ڈال دیا۔ بعد میں یہی اس کا معمول ہوگیا۔

کبھی شیخ رمضانی کی قبر بھلے ہی زمین کی سطح بن جائے لیکن جو پودا آج بہت تیزی سے آسمان کو چھونا چاہتا ہے اور جس کی جڑیں زمین میں نہ جانے کہاں تک پھیل جائیں گی کوئی نہیں جانتا۔ ■

کنّی کا راجکمار

ہاں تو صاحبان......قدردان......مہربان
جگر تھام کر بیٹھ جایئے۔ جی چاہے تو اٹھ جایئے
اپنے مایوس چہروں پر ہنسی لایئے۔ دنیا سے تھوڑی غشی لایئے
بہت رو چکے۔ بے حسی لایئے
صاحبان......قدردان...... میں کون ہوں۔ کیا ہوں۔ کیوں ہوں
یہ سب آپ جانتے ہیں
مجھے دل سے مانتے ہیں
یہ آپ کی بستی ہے
جہاں جان سستی ہے
روز کوئی مرتا ہے
اور مرنے سے ڈرتا ہے
موت تو برحق ہے
اوپر بھی دوزخ ہے
میرے پاس جنت ہے۔ میرے پاس سپنے ہیں۔ آپ بھی اپنے ہیں۔
یہ کون سی بستی ہے
جو ہمیشہ سسکتی ہے

چیخ ہے پکار ہے

غصہ ہے انگار ہے۔ کچھ ہونے کا انتظار ہے

یہاں سپنوں کا شاسن ہے

اور ہوا میں آسن ہے

جہاں سورج بیکار ہے

اندھیروں کا بیوپار ہے

میرے پاس تیج کا بھنڈار ہے

تو حاضرین! آپ کے سامنے سپنوں کا راجکمار ہے

میں جانتا ہوں۔ کنی بھی بھوکی ہے۔ مہرالنساء بھی دکھی ہے

کنی کو روٹی کا انتظار ہے۔ مہرالنساء شادی کے لئے بے قرار ہے۔ تو صاحبان۔ قدردان۔ آج میں مہرالنساء کو لڑکا دوں گا اور کنی کو روٹی۔ یہ رہی میرے سپنوں کی جھولی۔ دھیرے دھیرے سبھوں کو خوشی دوں گا۔ چلو کنی چلو۔ میرے ساتھ چلو میری دنیا میں چلو۔ ارے گھبراؤ نہیں۔ کچھ پل کے لئے تو زندہ رہنے کی کوشش کرو۔ کنی اپنی آنکھوں کے آنسوؤں کو مجھے دے دو۔ اپنی بڑی بہن مہرالنساء کو بھی سمجھاؤ کہ ابا اس کی شادی کر ہی نہیں سکتے۔ اب وہ چھتیس کی ہوگئی ہے۔ آنکھوں کے نیچے کالے دھبے آگئے ہیں۔ ہڈیاں ہر طرف سے ابھرنے لگی ہیں۔ کنی سمجھاؤ اسے کہ ابا نہیں لا سکتے اب دو وقت کی بھی روٹی۔ بھلا مہرالنساء کی شادی کہاں سے کریں گے۔ کنی تم بھی پندرہ سال کی ہوگئی ہو اور اب تک روتی ہو روٹی کے لئے! تمہیں تو اور بھی رونا ہوگا۔ دیکھ لو مہرالنساء کی آنکھوں کے نیچے ابھرتے ہوئے کالے دھبے کو۔ تم نہیں ڈرتیں اس دھبے سے؟ تم نہیں ڈرتیں جگہ جگہ سے نکلنے والی ہڈیوں سے؟ کنی......! میری اچھی کنی۔ تم ابھی کام کی ہو۔ ہونٹوں کے لئے جام سی ہو۔ روٹی کے لئے رونا چھوڑ دو۔ اپنے جیون کی نیاّ موڑ

دو۔ اوہ! اب تم کیا سوچنے لگی۔ تم ایسی گمبھیرتا سے مت جیو۔ اس سے پہلے کہ کئی سے قمر النساء بن جاؤ۔ آؤ میرے ساتھ آؤ۔ میں لال پری بنادوں گا۔ دیکھو میری جھولی میں رکھے ہیں، رنگ برنگ کے پریوں کے پر۔ تمہیں اپنے لئے جو اچھا لگے چن لو۔ ہاں ہاں آؤ میرے ساتھ آؤ۔ اب مت دیکھو مہر النساء کی طرف۔ بڑھو۔ آگے بڑھو کئی۔ مت منانے کی کوشش کرو مہر النساء کو۔ وہ جانتی ہے اپنی حقیقت۔ وہ آنکھوں کے نیچے جمے کالے دھبے کو لے کر کہاں جائے گی؟ تھوڑا سفر اور طے کرنا ہے اسے۔ پھر راہ میں ہی مر جائے گی۔ کئی! اگر تم نے سب کچھ پالیا تو بدل جائیں گے حالات بھی۔ مہر النساء کے دس سال کم کردینے، اسے گوشت پوست میں تبدیل کرنے، صرف ایسا ہی نہیں، موت کے انتظار میں، جینے والے تمہارے ابا کو جینے کی چاہت دلانے کی بھی گارنٹی۔ کئی کیا سوچ رہی ہو۔ تم خوبصورت ہو۔ زندہ ہو۔ پھر کاہے کا غم......! اچھا ایسا کرو آج کی رات سوچ لو۔ کل کا دن بھی تمہارا۔ چلو نیند آنے تک دوسری شب کی آدھی رات بھی تمہاری۔ میں پھر آؤں گا پچھلے پہر۔ اگر کھلی آنکھوں کا سپنا ہو تو میرے ساتھ چلنا۔ سونے دینا مہر النساء اور ابا کو۔ انہیں اب جگانے کی بھی ضرورت نہیں ہے لیکن تم جو اور آنے والی راتوں میں ان کے ساتھ سوئیں تو میں تمہاری بستی سے چلا جاؤں گا۔ کئی تم میرے ساتھ نہیں آئیں تو کوئی خواب پورا نہیں ہوگا مہر النساء اور تمہارے ابا کا۔ میں رات کے پچھلے پہر آؤں گا۔ تم سوچ لینا۔ خوب سوچ لینا۔

سپنے لے کر آنے والا نوجوان اپنی چھڑی ہلاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ چونکہ ایک امید دے کر وہ رخصت ہوا تھا اس لئے کئی نے روکا نہیں۔ اس کے جانے کے بعد مہر النساء نے کئی کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ بوسیدہ کمرے میں لوٹ آئی۔

آج پہلی رات تھی۔

مہر النساء کا یوں بھی برسوں سے نیند سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ اپنی آنکھیں بند کیے سوچتی

رہی۔ آج کنی بھی اس کی بیداری میں شامل تھی۔ مہرالنساء نے محسوس کیا کہ وہ بے چین ہے۔

'کیا ہوا کنی...... سو کیوں نہیں جاتی؟'

'ہاں سو جاؤں گی......'

'کنی کیا سوچا ہے تم نے......'

'کچھ بھی نہیں۔'

'تو پھر کیوں جاگ رہی ہو؟'

'اب تو حد ہوگئی۔ دو دنوں سے پیٹ میں کچھ بھی نہیں، تو پھر نیند کہاں سے آئے گی۔'

'کنی......! میں تیری بڑی بہن ہوں۔ برا تو نہیں چاہ سکتی۔ تو مجھ جیسا کیوں بننا چاہتی ہے۔ ابا کسی لائق نہیں رہے۔ اماں تھیں تو کس طرح گھر میں رونق تھی، کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ کیا گئیں۔ سب کچھ؟ ابا شرافت کے پردے میں رہ کو خود بھی ایک روز گزر جائیں گے۔ تو بھی مجھ جیسی ہو کر مت رہنا کنی۔ ہم پردے کے باہر نہیں جاسکتے۔ صرف مل سکتے ہیں سپنوں کے راجکمار سے۔ میرا راجکمار تو بوڑھا ہوگیا ہے۔ وہ برسوں سے میرے پاس نہیں آتا۔ تیرا راجکمار ڈھیر ساری امنگوں کے ساتھ تیرے پاس آیا ہے۔ تو چلی جا اس کے ساتھ۔'

'لیکن باجی...... تم......!'

'کنی......! میں؟ میں ہوں کہاں؟ تجھے لگتا ہے کہ میں کہیں ہوں؟ تو نے نہیں دیکھا راجکمار تجھے بلانے آیا تھا۔ تیرے لئے اس نے روپ بھی بدل لیا تھا۔ مجھے تو اس نے ایک پُل سمجھ رکھا تھا۔ مجھے چونکانے کے لئے پرانے زخم کرید رہا تھا۔'

مہرالنساء بولتی رہی۔ بہت دیر تک بولتی رہی۔ پھر وہ بہک جاتی ہے۔ اندھیروں میں جا کر کچھ تلاش کرنے لگتی ہے۔ اپنی چکٹ سی پوٹلی سے نکالتی ہے بندیا۔ ٹوٹا ہوا آئینہ۔ اور چاہ کر بھی کوئی روشنی نہیں ملتی کہ وہ اپنے ماتھے پر اسے چمکتے ہوئے اس آئینے میں دیکھ سکے۔ تب وہ دیر تک رات کو سرکتے ہوئے دیکھتی رہتی ہے۔ دیکھتی ہی جاتی ہے۔ وہ اپنے روایتی مگر بوڑھے راجکمار کے بارے میں پھر سے سوچنے لگتی ہے۔

گھریلو تعلیم مکمل کرنے کے بعد پورے خاندان میں صوم وصلوٰۃ کے پابند ہونے کی خوبیوں نے اس میں زبردست اعتماد بھر دیا تھا۔ اس قدر پُر خلوص کہ ہر کوئی پنے گھر کی بہو بنانے کے لئے بے چین۔ ڈگری یافتہ نہ ہونے کے باوجود اخباروں اور رسائل پر گہری نظر رکھتی تھی۔ آئی ۔اے۔ ایس کی تیاری کرنے والے اپنے خالہ زاد بھائی میاں شبو سے وہ اکثر بحث کرتی تھی۔ چونکہ دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے تھے اس لئے گھر والوں کے سامنے نفسیاتی سطح پر غیر محرم ہونے کا مسئلہ بھی نہیں اٹھ پایا تھا۔

جنرل نالج کے معاملے میں اکثر مہرالنساء شبو بھائی پر حاوی ہو جاتی تھی۔ شبو بھائی کہتے کہ یہ تیاری تمہیں کرنی چاہئے تھی تو مہرالنساء کہہ دیتی کہ یہاں نالج سے زیادہ ڈگری کی اہمیت ہے۔ کیونکہ ہمارا ایجوکیشنل سسٹم ہی کچھ ایسا ہے کہ چاہے صلاحیتیں ہوں کہ نہ ہوں، لیکن ڈگریوں کا بوجھ بہت ضروری ہے۔ میرے ابا کی تو انگریزی اتنی اچھی ہے کہ ان کے ڈرافٹ پر نام نہاد ڈگری یافتہ چاہ کر بھی غلطی نہیں نکال سکے۔ لیکن......؟

شبو بھائی مہرالنساء کی ذہانت سے بخوبی واقف تھے۔ اسے بہت پسند بھی کرتے تھے۔ یہاں تک کہ صوم وصلوٰۃ کی پابند لڑکی کو جسم و جان کی اہمیت سے واقف کروایا۔ اسے عشق مجازی کی تمام تر لذتوں سے گزارنے کی کامیاب کوشش کرتے ہوئے زندگی بھر ساتھ رہنے کا اعتماد بھی دے ڈالا۔ مہرالنساء خواب دیکھنے لگی۔ وہ دلہن کے روپ میں بجی سنوری۔ ڈھولک کی تھاپ،

میراثن کی بے سُری آواز۔

بنو تیرا مکھڑا لاکھ کا رے

بنو تیرا بیسر لاکھ کا رے

بنو تیری نتھیا ہے ہزاری

بنو تیری انکھیاں سرے دانی

پھر ایک گھر ،ایک خوبصورت خاوند ، بچے، دفتر، انتظار، نوک جھونک، راز کی باتیں، تفریح۔

لیکن شبو بھائی آئی۔ اے۔ ایس آفیسر نہیں ہو سکے۔ سخت ذہنی الجھنوں میں گرفتار ہوئے۔ سارے خاندان میں، موردالزام مہرالنساء کو ٹھہرایا گیا اور پھر بدنامیاں گھر سے گلی اور گلی سے بازار پہنچیں۔ شبو بھائی دو تین عشقیہ تجربوں کے بعد ایک تجربہ کار عورت نما لڑکی کی گرفت میں آگئے۔ اور پھر بمشکل کلرک ہوئے اور چار بچیوں کے باپ بننے کے بعد داڑھی بڑھالی۔ سخت مذہبی ہوگئے۔ مہرالنساء کے بارے میں سوچنا بھی گناہ سمجھنے لگے۔ لیکن بیچاری مہرالنساء کر بھی کیا سکتی تھی۔ اس نے جو نہیں کیا ان گناہوں کی سزا جھیل رہی تھی۔ اب تو زندہ رہنے کے لئے شبو بھائی کو راجکمار کے روپ میں دیکھنا اس کی مجبوری تھی۔ اور ایسے میں جب دور سے آتی ہے فجر کی اذان کی آواز تو وہ ابا کے لئے وضو کا پانی رکھ دیتی ہے اور خود مصلیٰ بچھا کر بیٹھ جاتی ہے کہ اب اکثر اسے وضو کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ وہ دعا کے لئے ہاتھ نہیں اٹھاتی، صرف جھک کر کچھ سوچتی رہتی ہے۔ چاہتی ہے آنکھوں میں آنسو آئے لیکن یہ دعا بھی قبول نہیں ہوتی۔

اس روز کنی کو اپنے ہاتھوں سے خوب سجایا سنوارا۔ اپنی بندیا اس کے ماتھے پر لگادی۔

سورج کی کرنوں میں اس کا روپ اور بھی دمکنے لگا۔ ایسا لگا جیسے گھر کی کھوئی ہوئی رونق لوٹ آئی ہو۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کٹی اتنی خوبصورت بھی ہے۔ سپنوں کے راجکمار کی نگاہ پر مہرالنساء کو رشک ہونے لگا تھا۔ اس روز کٹی کو بھوک بھی نہیں لگی۔ وہ امیدوں کے ساگر میں ڈوبتی چلی جارہی تھی اور جب جب وہاں سے ابھرتی ہتھیلیاں موتیوں سے بھری ہوتیں۔ وہ کنارے پر کھڑی مہرالنساء کی طرف سب کچھ اچھالتی جاتی۔ مہرالنساء ساحل پر ہی مچلتی رہتی۔

شام سے ہی سپنوں کے راجکمار کا انتظار تھا۔ کٹی بار بار دریچے کی طرف دیکھتی اور پھر بے چینی کے عالم میں بوسیدہ کمرے میں ٹہلنے لگتی۔ مہرالنساء اس کی بے بسی میں جینے کی آرزوؤں کو محسوس کرتے ہوئے بہت خوش تھی۔ وہ جانتی تھی کہ راجکمار وعدے کے مطابق رات کے پچھلے پہر آئے گا لیکن انتظار فیصلے کو مستحکم بنانے کے لئے ضروری تھا۔ اس نے کٹی کو نہیں سمجھایا کہ راجکمار رات کے پچھلے پہر آئے گا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں کٹی سو نہ جائے کیونکہ وہ کھلی آنکھوں کی راجکماری کے لئے آنے والا تھا۔ نیند میں ڈوبی ہوئی کٹی کے لئے نہیں۔ کچھ اور رات گزرتی ہے۔ مہرالنساء جان بوجھ کر بستر پر جاکر آنکھیں بند کرلیتی ہے اور وہ کٹی کی بے چینی کو محسوس کرتی رہتی ہے۔ کٹی اس دوران ابا کے کمرے میں بھی جاتی ہے۔ انہیں بھی روز کی طرح مضمحل پاتی ہے۔ سوچتی ہے کہ کیسے انہیں زندہ کیا جائے۔ وہ تو اب زور سے کھانس بھی نہیں سکتے۔ نہ جانے ایک ٹک کیا دیکھتے رہتے ہیں۔ کسی کو ٹھیک سے پہچانتے بھی نہیں۔ آہٹوں پر چونکنے کا سلسلہ بھی بند ہوچکا ہے۔ کٹی کی آنکھوں میں تو آنسو ہیں۔ وہ اپنے تمام آنسوؤں کو آج اس گھر کی نذر کردینا چاہتی ہے۔ باجی اسے نہیں دیکھ پارہی ہیں۔ ابا بھی اس قابل نہیں کہ اسے پہچان سکیں۔ وہ ماتم تو کرہی سکتی ہے۔ راجکمار کے آنے سے پہلے وہ گھر کی دہلیز کی مفلسی کو آنسوؤں سے دھودینا چاہتی ہے۔ مہرالنساء اسے رونے دیتی ہے۔ اس کے من کے بھاری پن کو دور ہونے دیتی ہے۔ اور پھر ایسے میں رات کا پچھلا پہر شروع ہونے لگتا ہے۔

راجکمار کی آمد کے لئے وہ چہرے کو مسکان سے بھر دیتی ہے۔ آنکھیں ایک دم کھلی رکھتی ہے۔ نیند سے کوئی رشتہ رکھنا نہیں چاہتی آج کی رات۔

اور ایسے میں آتا ہے راجکمار۔ وہ دھیرے دھیرے گھر کا دروازہ کھولتی ہے۔ راجکمار کے بڑھے ہوئے ہاتھوں میں خود کو سونپ دیتی ہے۔ اور پھر چاروں طرف اندھکار بکھیر کر وہاں سے غائب ہو جاتی ہے۔ مہرالنساء بند آنکھوں سے ہر منظر کو سرکتے ہوئے محسوس کرتی ہے اور پھر دروازہ بند کرنے کے بعد مصلّی پر بیٹھ جاتی ہے۔ دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتی ہے۔

راجکمار کنّی کو پریوں کے لباس میں شہر کی رونقوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ کنّی مختلف ہاتھوں سے گزرتے ہوئے لال پری بن جاتی ہے۔ کنّی سب کچھ جانتی تھی۔ اس نے کھلی آنکھوں سے فیصلہ کیا تھا۔ ایسا نہیں کہ وہ خوش نہیں ہے کیونکہ راجکمار نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ مہرالنساء کی عمر دس سال کم ہو گئی ہے۔ اسے اب اپنا بوڑھا راجکمار بھی یاد نہیں آتا۔ ابا گھر میں رنگین ٹیلی ویژن پر فلمیں دیکھتے رہتے ہیں اور انہیں انتظار ہوتا ہے ڈاکیے کا، جو کنّی کے بھیجے ہوئے روپے لے کر آتا ہے۔

ہاں تو صاحبان...... قدردان......

یہ کھلی آنکھوں کے سپنوں کو پورا کرنے والا راجکمار کون ہے۔ وہ اپنے وعدے بھی حقیقتوں کے رنگ میں ڈھالنا جانتا ہے۔ بس ضروری ہوتا ہے یہاں بیٹی کا جنم۔ آپ کی بوسیدہ بستیوں میں بیٹیاں ہوں تو چہرے پر ہنسی لائیے۔ بہت رو چکے۔ بے حسی لائیے۔

صاحبان...... قدردان......! ■

کشن پور کی مسجد

ستر سال کے رام دین بابو کو اچانک امام صاحب کے گزر جانے کا بہت دکھ تھا۔

کشن پور گاؤں کے باہر بنی مسجد اس اطراف مشہور ہے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ جب کبھی مسافر راستہ بھول جاتا ہے تو کچھ دیر بھٹکنے کے بعد مسجد کا گنبد یا مینار نظر آنے لگتا ہے تو گویا منزل مل جاتی ہے۔

کشن پور کے آس پاس دور دور تک کھیت کھلیان ہیں۔ کافی دوری پر چھوٹے گاؤں ہیں۔ وہاں سے ٹرینیں بھی گزرتی ہیں۔ بسیں آتی جاتی ہیں، مگر اب بھی سارے گاؤں ایک دوسرے سے نہیں جڑ پائے ہیں۔ پیدل چلنے کی روایت ابھی ٹوٹی نہیں ہے۔ دور تک کھیتوں اور پگڈنڈیوں کے سلسلے ہیں۔ بھیڑ بکریوں اور دوسرے مویشیوں کے جُھنڈ کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ سورج تو آج بھی دور کھلیانوں میں ڈوبتا ہے۔ اندھیرا ہونے پر مسجد کے مینار کی ہلکی روشنی میل کا پتھر بن جاتی ہے۔

کشن پور گاؤں کے پورب میں ایک چھوٹا سا تالاب ہے۔ تالاب کا پانی بہت صاف ہے اس لئے لوگ اسنان دھیان کے لئے بھی اس کا استعمال کرتے ہیں۔ کروا چوتھ یا چھٹ کے وقت اس کے چاروں طرف خوب صفائی کی جاتی ہے۔ اس صفائی میں گاؤں کے نوجوان آگے آگے رہتے ہیں چاہے پنڈت دیا رام شرما کا لڑکا شیکھر ہو، دینو جی کا بیٹا بنسی یا

امام صاحب کا لڑکا شاہد علی۔ ایسے موقعوں پر یہ مل جل کر پورے گاؤں میں ایک ماحول بنا دیتے ہیں۔ ایسا ہونے سے دوسرے نوجوانوں کا حوصلہ بھی بڑھ جاتا ہے۔

رام دین بابو گاؤں کے ایک خوش حال کسان ہیں، اور دل بھی اتنا بڑا ہے کہ ہر بھلے کام کو کرنے کے لئے سب سے پہلے اپنی سیوا پیش کر دیتے ہیں۔

گزشتہ چند برسوں میں رام دین بابو نے پورے گاؤں کو اپنا بھکت بنالیا ہے۔ ہوا یوں کہ گاؤں کے بیرونی حصے میں مسجد کا کام جاری تھا۔ کسان مزدور دن رات کام کر رہے تھے۔ مینار بنانے کے لئے تھوڑی اور زمین کے ساتھ اینٹوں کی بھی ضرورت تھی چندہ اُگاہی کا کام جاری تھا۔ کسی طرح مینار کا آدھا کام ہوا اس کے بعد پیسوں کی کمی کی وجہ سے کام بند ہو گیا۔

امام صاحب رام دین بابو کے برآمدے میں دیر تک بیٹھتے۔ دکھ سکھ کی باتیں ہوتیں۔ دونوں کا رشتہ خاصا پرانا ہو چکا تھا۔ ایک دن رام دین بابو نے امام صاحب سے پوچھا۔

'کیا بات ہے امام صاحب، مسجد کا مینار ادھورا کیوں ہے؟'

امام صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا' بات یہ ہے رام دین بھائی کہ پیسے ختم ہو چکے ہیں۔ مزدوری تو کسی طرح دی جا سکتی ہے۔ لوہے کا چھڑ، بالو، سیمینٹ وغیرہ بھی بچا ہوا ہے لیکن کم سے کم دس ہزار اینٹوں کی ضرورت ہے۔'

رام دین تھوڑی دیر تک چپ رہے۔ اس کے بعد بولے۔ 'امام صاحب اگر آپ چاہیں تو ہم دس ہزار اینٹوں کا انتظام کر دیں؟ دھرم کا کام ہے پونیہ ملے گا۔'

امام صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا،' آپ نے صرف ایک روپیہ میں مسجد کے لئے اپنی لگ بھگ ایک بیگھہ زمین دے دی، جب کہ اس سے آپ لاکھوں کما سکتے تھے۔ اتنا ہی نہیں

مسجد کے باہر پھیلی ہوئی زمین میں، آپ نے مکان اس لئے نہیں بنوایا کہ دور سے مسجد کا حصہ چھپ جائے گا۔ کیا اتنا ثواب کم ہے؟'

'ایسا ہے امام صاحب کہ گاؤں میں یہ مسجد ہم سب کی شان ہے۔ ایک پہچان ہے۔ ہمیں اچھا لگتا ہے اس لئے یہ سب کرتا ہوں۔ آپ نے اپنے لڑکے کو حافظ بنایا ہے لیکن جب ہمارا کوئی آیوجن ہوتا ہے تو شاہد میاں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ بولئے ایسا ہے کہ نہیں؟'

'لیکن رام دین بابو کوئی اتنی بڑی قربانی نہیں دیتا ہے۔ اب لوگ پیسے کے لئے اپنے خون تک کو نہیں چھوڑتے ہیں۔'

'امام صاحب، دنیا کچھ ہی لوگوں سے چل رہی ہے، برائی کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔ اچھائی کی کوئی سیما نہیں ہوتی ہے۔ آپ ہی بتایئے کہ جب نماز پڑھ کر مسجد سے باہر نکلتے ہیں تو گھنٹہ بھر سے انتظار کرنے والوں میں پانی پھونکنے سے پہلے کیا آپ دیکھتے ہیں کہ یہ رام دھن چور کی بیوی یا کلو دلال کی بیٹی اپنے بیمار بچے کی صحت کے لئے پانی دم کروانے آئی ہے۔ آپ ان کے گھر والوں کی برائیوں کے بارے میں کبھی نہیں سوچتے ہیں؟ بس پانی دم کر دیتے ہیں۔'

امام صاحب رام دین بابو کو دھیان سے سنتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ 'سمجھ گیا آپ اینٹ دے کر رہیں گے۔'

دونوں زور سے ہنسے اور پھر رام دین اچانک سیریس ہو کر کہتے ہیں۔

'اس بار دس ہزار اینٹوں کے دس روپے لوں گا۔ کاروباری آدمی ہوں۔'

ہنسی اور تیز ہو جاتی ہے۔ پھر رسمی طور پر محض دس روپے لے کر رام دین بابو حسب ضرورت اینٹیں دے دیتے ہیں اور پھر ادھورے مینار کا کام پورا ہو جاتا ہے اور دور دراز کے لوگ اسے دیکھنے کشن پور ضرور آتے ہیں۔

رام دین اور امام صاحب کی گہری دوستی ایک مثال بن گئی۔ کسی کو یقین نہیں ہوتا کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی رہتے ہیں۔ نفرت یا بھید بھاؤ نے کبھی کشن پور کے مکینوں کو چھوا ہی نہیں۔ امام صاحب اور رام دین بابو کی دوستی کا دوسرے بعض لوگوں سے زیادہ اثر امام صاحب کے بیٹے شاہد علی پر پڑا تھا۔ شاہد علی ایک مدرسہ چلاتے ہیں لیکن کسی نہ کسی بہانے روز بچوں کو دونوں کی دوستی کے بارے میں بتانے سے نہیں چوکتے تھے۔ امام صاحب نے اپنے بیٹے کو وصیت کی تھی کہ اگر انہیں کچھ ہوگیا تو رام دین چاچا کا ضرور خیال رکھنا۔ حالانکہ اس وصیت سے پہلے سے ہی شاہد علی رام دین بابو کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ جب کوئی چھوٹا سا موقع بھی ملتا تو خدمت کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ رام دین کے لڑکوں کا بھی کچھ یہی حال تھا۔

فجر کی اذان خود امام صاحب دیا کرتے تھے۔ یہ آواز چاروں طرف کچھ ایسے پھیلا کرتی تھی، جیسے سب کے اندر ترنگیں پھوٹ رہی ہوں۔ بہتوں کی طرح رام دین بابو کو بھی امام صاحب کی آواز بہت بھلی لگتی تھی۔ صبح کی اذان کی آواز سن کر ہی رام دین جگا کرتے تھے۔ چاہے کوئی موسم ہو اس وقت تالاب میں اسنان کرتے پھر اسی جگہ چھوٹے مندر میں پوجا پاٹھ کرتے۔ سورج کو نمسکار کرنے کے بعد گھر لوٹ آتے۔ تب تک امام صاحب بھی ڈیوڑھی میں آکر رام دین کے کھیتوں اور مویشیوں کو نہارتے رہتے۔

رام دین بابو کے لوٹنے کے بعد ان کا لڑکا چائے بنا کر دونوں کے سامنے رکھ دیتا۔ پھر گھر بار کھیتی باڑی کی باتیں شروع ہوتیں۔ دونوں کی دلچسپ چھیڑ چھاڑ بھی ہو جاتی۔

اچانک امام صاحب کے گزر جانے کا سب سے زیادہ اثر رام دین بابو پر ہوا۔ اب کیا ہوگا؟ اس عمر میں جینے کا انداز بھی تو نہیں بدلا جا سکتا ہے۔ روز کی طرح صبح امام صاحب سے ان کی باتیں ہوتی تھیں۔ دونوں گاؤں کے باہر پیپل کے پیڑ کے نیچے ایک چبوترا بنانے کی یوجنا تیار کر چکے تھے۔ ظہر کی نماز کے بعد امام صاحب پر دل کا دورہ پڑا۔ کسی کو خدمت کا موقع نہیں دیا اور

چپکے سے گزر گئے۔ شام میں انہیں پاس کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ رام دین بابو تو ڈیوڑھی میں بیٹھ کر بس ایک ٹک مسجد کو دیکھتے رہے۔ پھر شاہد علی خود ان کے پاس آیا اور لپٹ کر زور زور سے رونے لگا۔ انہوں نے شاہد علی کو صبر کرنے کے لئے کہا لیکن دونوں کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ پھر شاہد علی ہی رام دین کو سمجھانے لگے۔

'ابا تو گزر گئے۔ اب آپ بھی اس طرح ٹوٹ جائیں گے تو پھر ہمارے سر پر کس کا سایہ رہ جائے گا؟'

شاہد علی کی باتیں سن کر رام دین بابو بولے، 'نہیں بیٹا، میں تیرے باپ کی طرح نہیں ہوں۔ میں تو ڈٹ کر زندہ رہوں گا...... میں......'

پھر دونوں گلے مل کر دیر تک روتے رہے۔ جی کچھ ہلکا ہوا تو شاہد علی کو رام دین کے بیٹے نے گھر پہنچا دیا اور بابو جی کو بھی سمجھا بجھا کر سلانے کی کوشش کرنے لگے۔ رام دین بابو نے بظاہر آنکھیں بند کر لیں۔ گھر والوں نے سمجھا کہ اب سو جائیں گے۔ سبھی دھیرے دھیرے وہاں سے ہٹ گئے۔ اس رات رام دین بابو سو نہیں سکے۔ امام صاحب کے ساتھ گزرے ہوئے دن یاد آتے رہے۔ پچاس برسوں کا رشتہ۔ کوئی معمولی رشتہ تو نہیں تھا۔ پہاڑ جیسی رات۔ جس کی صبح میلوں لمبی ہو گئی تھی۔ رام دین بابو بیچ بیچ میں اٹھ کر ستاروں کی گردش کو دیکھتے۔ صبح ہونے میں دیر تھی۔ بے چین ہو کر ڈیوڑھی میں آ کر ہی بیٹھ گئے۔ انہیں ایسا احساس ہو رہا تھا کہ بس امام صاحب ابھی مسجد سے لوٹ کر آئیں گے اور ان سے باتیں کریں گے۔ پھر انہیں صبح کی اذان کا خیال آیا۔ امام صاحب تو گزر گئے اب صبح کی اذان کون دے گا؟ دھیرے سے اٹھے، لالٹین لے کر امام صاحب کے گھر کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کے دروازے پر پہنچنے کے بعد کچھ دیر تک خاموش کھڑے رہے۔ چاروں طرف گہرا سناٹا تھا۔ پھر انہوں نے شاہد علی کو بلایا۔ شاہد بھی جگ ہی رہے تھے، فوراً باہر آ گئے۔ رام دین چاچا کو اس وقت دیکھ کر ایک دم پریشان ہو گئے۔ پوچھا:

'کیا ہوا چاچا مجھ کو بلالیا ہوتا۔'

رام دین بولے۔' کچھ نہیں بیٹا، سب ٹھیک ہے۔ بس ایک بات پوچھنے آیا ہوں۔'

'بولئے...... چاچا......'

بہت مضمحل ہو کر رام دین چاچا نے کہا۔' بیٹا امام صاحب تو گزر گئے۔ تم جانتے ہو صبح کی اذان بھی وہی دیتے تھے۔ مگر اب یہ اذان کون دے گا؟ یہی چنتا تھی......'

لمحے بھر کے لئے شاہد علی پر سکتہ طاری ہو گیا۔ پھر انہوں نے آسمان کی طرف اپنا ہاتھ اٹھایا۔ بہت کچھ بولنے کی کوشش کی۔ لیکن کچھ بول نہیں پائے۔ رام دین چاچا نے ہاتھ تھام لیا۔ آنکھوں میں ایک سیلاب ابھرنے لگا۔ شاہد نے بھرّائی ہوئی آواز میں اتنا ضرور کہا۔

'کون کہتا ہے چاچا کہ انسان مر چکا ہے۔ آپ جیسا کوئی ایک آدمی بھی زندہ رہا تو دنیا چلتی رہے گی۔ آپ پوچھ رہے تھے نا کہ اب صبح کی اذان کون دے گا؟ تو چاچا آپ مت گھبرایئے۔ اب یہ کام میں کروں گا۔ میری آواز آپ کو جگایا کرے گی۔'

رام دین بابو کے من کا بوجھ جیسے ہلکا ہو گیا اور وہ اپنے گھر لوٹ آئے۔

کچھ دیر بعد شاہد علی صبح کی اذان دے رہے تھے۔ رام دین بابو کو سن کر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ امام صاحب پھر سے جی اٹھے ہیں۔ انہوں نے دیر تک اذان سنی اور پھر روز کی طرح پاس والے تالاب میں اشنان کرنے کے لئے باہر نکل گئے۔ ■

کوئی ہاتھ

بیٹی کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی۔ اب دس دنوں میں سب کچھ ہو جانا تھا۔ لڑکا بہت بھلا مل گیا تھا۔ سرکاری نوکری کرنے والا، لین دین سے دور۔ بس ایک فرمائش کر ڈالی تھی کہ باراتیوں کی ٹھیک سے خاطرداری ہونی چاہئے۔ منوہر سنگھ نے اپنی دو بیٹیوں کی شادی حال میں کی تھی۔ خود ایک معمولی کلرک، بے حد ایماندار، قرض میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ریما ان کی تیسری اور سب سے چھوٹی لڑکی تھی۔ پہلے دو بیٹیوں کی شادی میں گاؤں والوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ جس سے جو کچھ بن پڑا، کیا تھا۔ اب ایسے میں منوہر سنگھ کس کے سامنے ہاتھ پھیلاتے۔ لڑکے نے کچھ نہیں مانگا تھا لیکن دوسرے داماد کو جو کچھ دیا گیا تھا، اتنا نہ بھی سہی لیکن خالی ہاتھ تو نہیں بھیج سکتے تھے بیٹی کو۔ ان سے جو سکا ریما کے لئے کر بھی دیا تھا۔ مگر لڑکے نے کچھ نہ مانگ کر انہیں زیادہ پریشان کر دیا تھا۔ کیونکہ منوہر سنگھ لالچی لوگوں کو ایک دم پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر جو ایماندار ہو، لالچ سے دور ہو، اس کے لئے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار رہتے تھے۔ باراتیوں کو کوئی شکایت نہ ہو۔ ابھی ان کے لئے یہی سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ بہت کوششوں کے بعد اس کام کے لئے کچھ روپے جمع کر پائے۔ مگر قیمت کا پتہ لگایا تو کانپ اٹھے۔ اتنے کم روپے میں تو سبھوں کو معمولی ناشتہ بھی نہیں کروایا جا سکتا تھا۔ منوہر سنگھ بہت کچھ سوچ کر پسینے سے شرابور ہو گئے۔ بس دو ماہ پہلے کی بات ہے۔ رام کرپال کی بیٹی کی بارات اسی لیے لوٹ گئی تھی کہ باراتیوں کا سواگت ٹھیک سے نہیں ہو سکا تھا۔ لڑکے نے کوئی شرط نہیں رکھی تھی۔ وہ اپنی عزت کے لئے سسرال والوں سے باراتیوں کی بہترین آؤ بھگت چاہتا تھا۔ ایک طرح سے ان کا

سوچنا بھی غلط نہیں تھا۔ مگر اسے لڑکی والوں نے گمبھیرتا سے نہیں لیا اور اونے پونے سب کچھ کرنے کے چکر میں لڑکے والوں کا ایمان تک کر ڈالا۔ پھر کیا تھا، مونچھ کی لڑائی ہوگئی۔ اور بارات واپس چلی گئی۔ مگر یہ صدمہ لڑکی سہہ نہیں پائی اور جب رات میں سب سو رہے تھے تو گھر کے کنویں میں کود کر اپنی جان دے دی۔

منوہر سنگھ ایسا سوچ کر تھر تھر کانپنے لگے۔ سوچا لڑکے والوں کو جا کر کہہ دیں کہ ہم آپ کی خواہش پوری نہیں کر سکتے۔ مگر یہ بھی بہت برا ہوگا۔ کیونکہ سبھی جان چکے تھے۔ پیشگی مبارک باد بھی مل چکی تھی۔ بڑی بات یہ ہے کہ ہر طرف شادی کا ماحول بن چکا تھا۔ قرض میں ڈوبے منوہر سنگھ کو پھر یہ خیال آیا کہ شیخ جمعراتی کے پاس جا کر اپنا دکھڑا سناتے ہیں، کیونکہ اس کی ایسی حیثیت ہے کہ بیس پچیس ہزار کا انتظام کر سکتا ہے۔ ڈر یہ تھا کہ وہ بلا کا کنجوس مشہور تھا۔ اب تک ایک پائی کسی کو دیتے ہوئے نہ دیکھا نہ سنا گیا تھا۔ منوہر سنگھ نے گاؤں میں جن سے روپے لئے تھے، انہوں نے پہلے ہی مجبوری ظاہر کر دی تھی۔ کیسے کیا کیا جائے؟ پھر ایک یہ بات بھی من میں آئی کہ کیوں نہ ٹال کے پاس والی زمین کو گروی رکھ دیا جائے۔ تب یہ فکر بھی ستانے لگی کہ کوئی اس زمین پر قرض نہیں دے گا۔ کیونکہ سبھی جانتے ہیں کہ وہ برسوں سے بنجر پڑی ہے۔ اسی وقت شیخ جمعراتی کا گہرا دوست شوبالک مہتو راستے سے گزر رہا تھا۔ منوہر سنگھ نے اسے روک کر اپنی پریشانی بتا ڈالی۔ شوبالک نے کہا کہ پورا گاؤں جانتا ہے کہ آپ کو بیس پچیس ہزار روپئے کی ضرورت ہے، کیونکہ بھوجی بھی جگہ جگہ جا کر بتا چکی ہیں۔ لیکن حال میں لوگوں نے مل جل کر آپ کی بڑی بیٹیوں کی شادی میں جو بھی مدد ہو سکی کر ڈالی تھی۔ اس لئے اب آشا رکھنا بیکار ہے۔ رہی بات شیخ جمعراتی کی تو اس مکھی چوس کے پاس جانے سے تو اچھا ہے لڑکے والوں سے سال دو سال کا وقت لے لو۔

شوبالک مہتو نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ واقعی ابھی کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی وہ ادھیڑ بن میں لگے ہی رہے۔ کئی دنوں کی کوششوں کے بعد جی کڑا کر کے شیخ جمعراتی کے دروازے پر پہنچے۔ وہ اندر بیوی کو زور زور سے ڈانٹ رہا تھا۔

'تم کو عقل نہیں آئے گی۔ مجھ کو برباد ہی کر ڈالوگی۔ دونوں بٹن رکھنے کے لئے دیا تھا، کہاں کھو گیا! پیسہ پیڑ میں نہیں پھلتا ہے۔ لٹادو۔ لٹادو، سارا گھر لٹادو۔ عیش کرو عیش!'

'کیا عیش کرنا۔ کبھی سکھ نہیں ملا۔ روکھی سوکھی پر گزارا کرنا پڑتا ہے۔ دو بٹن! وہ بھی پلاسٹک کے۔ ارے دس پیسے میں مل جائے گا۔ دس پیسے میں۔ کنجوس کو اللہ نہیں بخشنے والا ہے۔'

جھگڑے کا سلسلہ چلتا رہا۔ منوہر سنگھ نے سوچا کہ جو کچھ سنا تھا، اس سے زیادہ سچ ہے۔ دو معمولی سے بٹن کے لئے ایک آدمی اتنا نیچے اتر سکتا ہے، اس سے ہم کیا امید کر سکتے ہیں؟ ایمان سے اچھا ہے واپس لوٹ جائیں، تب ہی شیخ جمعراتی کی آواز منوہر سنگھ کو اور بھی کرخت معلوم ہوئی جب اس نے کہا۔

'کون ہے باہر۔ تماشا ہو رہا ہے کیا؟ بھاگتے ہو یا نہیں؟'

یہ کہتے ہوئے شیخ جمعراتی باہر بھی آ گیا اور منوہر سنگھ کو دیکھ کر کسی حد تک نرم ہوا۔

'ارے منوہر بھائی آیئے! لیکن یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔ آپ کو پکار لینا چاہئے تھا۔'

'معاف کرنا جمعراتی بھائی! مجھے یہاں اس طرح کھڑا نہیں رہنا چاہئے تھا، معاف کرنا'

پھر جمعراتی نے بے رخی سے کہا۔ 'ٹھیک ہے ...... ٹھیک ہے۔ اب آہی گئے ہیں تو اندر آ جایئے۔'

'نہیں، نہیں مجھے جانا ہے۔'

'جانا تھا تو پھر آئے کیوں تھے؟'

منوہر سنگھ نے شیخ جمعراتی کے تیکھے تیور کو محسوس کرتے ہوئے سوچا تھوڑی دیر ٹھہر جانے میں ہی بھلائی ہے۔ پھر وہ اندر گئے۔ شیخ جمعراتی نے بیوی سے کہا، پانی اور چائے لے آؤ۔'

دونوں دیر تک چپ رہے پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں چائے پینے کے بعد منوہر سنگھ باہر نکل گئے۔ تب ہی پھر چیخنے کی آواز آئی۔

'ارے منوہر بابو...... ذرا اندر آیئے۔ بتایئے کوئی کام تھا؟ آپ تو میرے گھر کبھی نہیں آئے۔'

منوہر سنگھ مسکرائے اور بولے۔ 'نہیں کچھ نہیں...... بس یوں ہی ...... ہاں یہ پوچھنے آیا تھا کہ شادی کا نیوتا غلام غوث نے پہنچایا یا نہیں۔'

'ہاں پہنچا دیا ہے۔ آؤں گا......'

'ٹھیک ہے...... بس......'

تب ہی پیچھے سے جمعراتی کی بیوی نے اس کے ہاتھ میں کچھ لا کر دیا۔ جمعراتی نے وہ چھوٹی سی پوٹلی منوہر سنگھ کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ منوہر سنگھ نے کانپتے ہاتھوں سے پوٹلی کھولی۔ اندازے سے کم سے کم پچیس ہزار روپے تھے۔ منوہر سنگھ پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔

شیخ جمعراتی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ 'میرے بارے میں مشہور ہے کہ میں بہت کنجوس ہوں، برا آدمی ہوں، کسی کے کام نہیں آتا۔ سچ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ لوگ میرے بارے میں اچھا سوچیں۔ اس لئے کہ شاید میں سب کے لئے اچھا نہیں ہو سکتا۔ اللہ جس کی خدمت کا موقع دیتا ہے کرنے کی کوشش کرتا ہوں مجھے شوبا لک مہتو نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ تمہاری بیٹی میری بیٹی ہے۔ لڑکا اچھا مل گیا ہے۔ اس لئے ان کی چھوٹی سی خواہش پوری کر دو۔ اور ہاں ایک وعدہ کرو کہ اس کے بارے میں کسی سے کچھ بھی نہیں کہو گے۔'

منوہر سنگھ زور سے رو پڑے۔ شیخ جمعراتی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

'منوہر بھائی۔ میرے گھر کی طرف سب کے کان لگے ہوتے ہیں۔ اس لئے رونے کی آواز باہر جانے نہ پائے۔ یہ مجھ پر احسان ہوگا۔'

منوہر سنگھ کے آنسو تو نہیں تھمے لیکن جب تک شیخ جمعراتی کے گھر میں ٹھہرے، دروازے سے باہر کسی نے کوئی آواز نہیں سنی۔ ■

کاہے راکھے سائیاں

تاحدِ نظر پھیلا ہوا آسمان یوں تو زمین پر جھکا ہوا دکھائی دیتا ہے مگر یہ ایک سراب کی طرح ہے۔ لمبے سفر کے بعد بھی یہ ممکن نہیں ہو سکا کہ جو ہم دیکھ رہے تھے، وہ سچ تھا لیکن جو سچ نہ ہو اسے کیوں پیش کیا جاتا ہے ہمارے سامنے...... اب میں کچھ اور بھی سوچنے لگا ہوں کہ کہیں زمین سے ہی تو نہیں اگا ہے آسمان...... ہرے پیڑوں کا موسم ہو یا زمین پر بنائی ہوئی جنتیں، کسی نہ کسی طور پر ہم ان کا حصہ بن کر ابھرتے رہے ہیں۔ آسمان کی حقیقتوں کو پوجنے والوں کو زمین اپنے اندر سمیٹنے کی کوشش کر رہی ہے۔ شاید اب وہ بہت کچھ نہیں سہہ سکتی۔ لگاتار روندی جانے والی تہذیبیں، اس کے سینے کو شق کرنے والی مشینیں اور پستیوں سے بلندیوں تک پھیلی ہوئی عمارتوں کا بوجھ کون سہتا ہے۔

زمین اور آدم کی زمین تو ایسی نہیں تھی؟

کس نے حق دیا ایسا کچھ کرنے کا؟

کیا کھو گیا ہے آدم کی زمین کا تصور؟

کیوں زمین ہماری تحریروں کو اپنے سینے سے مٹا دینا چاہتی ہے؟

مگر یہ کھیل کون کھیل رہا ہے۔ صبحِ ازل بھی جسے انکار کی جرأت ہوئی تھی، وہ رازداں

بھی آدم کا نہیں تھا اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس جگہ اپنی خواہشوں کی جنگ بھی تو کوئی لڑ نہیں سکتا تھا۔ دلِ یزداں میں کھٹکنے والا دراصل وہ کون ہے اور کیوں ہے؟ یہ جاننے کی ضرورت آدم کو آج بھی ہے۔ جہاں پتے بھی نہیں ہلتے تمہارے حکم کے بغیر وہاں اس کائنات کا تصور کون کرسکتا تھا۔ زمین پر تب سے اب تک جو کچھ پھیلا ہے اس میں تمہاری ہی مرضی کا دخل ہے۔ مگر اب اپنی اُجرت لیتے وقت بھی ہمیں کیوں خوفزدہ کیا جاتا ہے۔ اس عظیم سانحے کے بعد ہی ہمارے اندر حاوی ہوگیا ہے یاس کا پہلو...... مگر کون سا سانحہ؟ شاید آپ نے محض سنا یا اسکرین پر آنے والی تصویروں کو دیکھا اور محسوس کیا ہے۔

اس روز جب سارا دیش اپنے بنائے ہوئے قانون کی عظمتوں کا پرچم بلند کررہا تھا تو زمین برہم ہوگئی۔ صبح کے اگتے ہوئے سورج نے یہ منظر دیکھا کہ کس طرح دیکھتے دیکھتے آسمان کو چھونے والی عمارتیں زمین دوز ہوگئیں۔ ایک پورا شہر ملبے میں تبدیل ہوگیا۔ کوئی بھی قانون یا سائنس اسے ایسا کرنے سے نہیں روک پایا۔ سارے شیرازے بکھر گئے۔ ہم اپنی بلندیوں سے پستیوں تک آنے کے لئے زندہ بھی باقی نہیں رہے۔ بظاہر قدرت کے قانون میں بھی ایسے حادثوں میں معصوموں کے قتل کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ بس جو کچھ بچا ہے یا زندہ رہنے کی جہاں سے کچھ امیدیں ہیں ہم اپنی بکھری لاشوں میں سے ہی ان امیدوں کو زندہ کرنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔

اس عظیم ترین المیے کے بعد سبھی ترقی پذیر ممالک تعاون کے لئے سامنے آئے۔ آسمانوں پر ہوائی جہاز تیرنے لگے، مگر ملبوں سے ابھرنے والی لاشوں یا بظاہر زندہ رہنے والے افراد تک وہ جیسے ہی پہنچے رضاکاروں کا ایک طبقہ وہاں ایسا بھی ملا جو ایسی لاشوں میں دلچسپی لے رہا تھا جن کے تن پر کوئی نہ کوئی قیمتی شئے ابھر رہی تھی...... بے ہوشی کے عالم میں ڈوبے ہوئے افراد کی مصنوعی شناخت نوچنے والوں کا بھی ہجوم تھا اس جگہ پر...... یہ کون لوگ تھے اور اگر یہ گناہ کی سزا تھی تو پھر یہ زندہ کیسے رہ گئے؟ یہ زمین دوز کیوں نہیں ہوئے؟ ان پر قدرت کا کون سا

قانون لاگو مانا جائے؟ پھر اس حادثے میں زندہ رہنے والے افراد کا وہ طبقہ بھی عجیب تھا جو اپنی تمام تر ہمدردیاں بکھیر رہا تھا مگر اندر سے بہت خوفزدہ تھا۔ وہ اپنے خوف کو عقیدت کا رنگ دینے کی کوشش میں مشغول تھا اور ان کی کوششوں کے درمیان ابھر رہی تھیں کئی زندہ کہانیاں......

آج مجھے فرصت نہیں کہ وہ تمام کہانیاں آپ کے سامنے پیش کرسکوں۔ لیکن جو کتھا کہنے جارہا ہوں وہ اس سانحے کے بعد حقیقت کی موہوم سی تصویر ہے۔ آپ چاہیں تو یہاں کوئی بھی رنگ بھر سکتے ہیں مگر تصویر جو اندر رچ بس گئی ہے وہ کبھی نہیں ابھرسکتی۔ کیونکہ اب سب سہمے ہوئے لوگ ہیں۔ صرف اس حادثے سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے بھی۔ جہاں اس زلزلے میں ایک لاکھ سے زیادہ افراد کے گزر جانے کی سچی خبریں ہمیں دی گئی ہیں۔ وہیں زمین کے دوسرے گوشے میں ذی ہوش زندہ رہنے والے افراد کے ذریعہ وِدھاتا کو خوش کرنے کے لئے یا اس حادثے سے خود کو محفوظ رکھنے کی امیدوں کے ساتھ یہ کتھا بار بار دہرائی جارہی ہے کہ اس حادثے میں یوں تو گھر کے سبھی افراد ملبے کے نیچے دب کر مرگئے مگر مردہ دادی کی گود میں ایک شیر خوار بچہ کئی دنوں تک ملبے میں دبا رہنے کے باوجود زندہ بچا رہا اور اسے بحفاظت ملبے سے نکال بھی لیا گیا۔ دادی کی موت نے اس بچے کو بچایا یا قدرت کے کھیل کا یہ ایک حصہ تھا، یہ میں نہیں جانتا۔ مگر اس شیر خوار بچے کے زندہ رہنے کا مجھے بہت دکھ ہے۔ دراصل اس عظیم ترین سانحے کے دوران اس بچے کا ہی سب سے زیادہ نقصان ہوا ہے۔ جو مرگئے انہیں مرجانا تھا۔ ان کی موت پر کوئی اپنا کہا جانے والا اگر بَین کرنے کے لئے موجود نہیں ہوتو شاید اس سے بہتر کوئی موت ہو ہی نہیں سکتی۔ بہت سے لوگ بے نام جیتے ہیں اور بے نام مرجاتے ہیں۔ بھیڑ کا کردار بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ جہاں ایک لاکھ افراد مرگئے وہاں کیوں زندہ رہا وہ شیر خوار بچہ؟ جہاں اس کا سارا پریوار زندہ دفن ہوگیا وہاں کیوں بچالیا گیا شیر خوار بچہ؟ دراصل اس حادثے کا سب سے بڑا سانحہ اس بچے کا زندہ نکال لیا جانا ہی ہے۔ بھوشیہ وانی کی گئی ہے کہ بچہ لمبی زندگی جیے گا مگر

دراصل وہ تو زندگی نما موت جیے گا۔

میں آنے والے برسوں میں اس بچے کو لگاتار بڑا ہوتے ہوئے تصور کرتا ہوں۔

ہوش سنبھالتے ہی اسے اسکرین پر دیکھنا پڑتا ہے اپنے اجداد کی موت کا دلدوز منظر۔ ملبے سے نکلی اپنی ماں،، بہن، بھائیوں، چچا، ماموں، خالو، نانی، دادی اور بھرے پُرے پریوار کے دوسرے افراد کی لاشیں۔ وہ ان لاشوں کو اپنے وجود پر حاوی ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اس کے ذہن میں کئی سوالات ابھرتے ہیں۔ وہ اپنے ہر سوال کے حل کے لئے بہت تگ و دو کرتا ہے۔ مذہبی کتابوں سے کبھی کبھی سکون ملتا ہے۔ خصوصی طور پر جب کوئی اسے مقدس گیتا کے شلوک کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے وہ انہیں آتم سادھ کرنے کا بھی عمل کرتا ہے۔ اس کی تنہائی میں گیانی کی آوازیں گونجتی رہتی ہیں۔

'کیوں کہ جو جنم لیتا ہے اس کی مرتیو نشچت (طے) ہے۔ اور جو مر چکا ہے، اس کے لئے شوک (غم) نہیں کرنا چاہئے۔ اس لئے جس سے بچا ہی نہیں جا سکتا اس کے لئے تجھے شوک نہیں کرنا چاہئے۔'

مگر اسی دوران دل کی کتاب پھر اسے پریشان کرنے لگتی ہے۔ اور وہ اپنی ماں، اپنے باپ اور دوسرے اجداد کی لاشوں کو ملبے سے نکلتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ دادی کی گود سے لپٹا ہوا بچہ ملبے سے زندہ نکالا جا رہا ہے۔ اخباروں میں اس کی تصویر شائع ہوئی ہے۔ لوگ قدرت کے اس کرشمے پر ششدر ہیں۔ مگر خیالوں میں ماں اسے زندہ رہنے کا حوصلہ دیتی ہے۔

'میرے بچے! تمہیں جینا ہے۔ تمہارے اندر میری چھوی ہے۔ میرا رکت ہے۔ ایک پریوار، ایک بستی، ایک شہر بسا ہوا ہے تم میں۔ تم ہی اس کل کی آخری امید ہو۔ ہمیں نہیں بچایا جا سکتا تھا اس لئے شوک کیسا؟ اب تمہیں اپنی بھومیکا نبھانی ہے میرے بچے!'

اب وہ ہر جگہ زندگی تلاش کرنے لگتا ہے۔ بلکہ جینے کا بہانہ تلاش کرنا ہی اس کا مقصد ہو جاتا ہے۔ حادثے میں سب کچھ کھونے والا بچہ بڑا ہو جاتا ہے اور بڑا ہو جاتا ہے اب وہ اس عظیم ترین سانحے کو وقت کی دبیز ساعتوں سے دبا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ہر طرف بے کسوں کی مدد کے لئے خود کو وقف کر دیتا ہے۔ لوگ اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ وہ سماج کا ایک ذمہ دار رکن بن کر ابھرنے لگتا ہے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ زندگی کے موڑ پر کوئی ایسا بھی آتا ہے۔ جس نے آدم کو زندہ رہنے کے لئے مجبور کیا تھا۔ عورت......اور وہ عورت دیر تک اس کا ساتھ نبھاتی ہے۔

وہ محبوبہ بنتی ہے، بیوی، ماں، پھر دادی، نانی اور رشتوں کا ایک طویل سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔ دائمی غم اور عارضی خوشی کے ساتھ وہ ایک طویل زندگی جی لیتا ہے۔ اس بیچ بہت سارے دنیاوی حادثے بھی رونما ہوتے ہیں۔ وہ حادثوں سے پریشان نہیں ہوتا۔ مگر جب غمِ جہاں کا حساب کرنے کے لئے خود کو تیار کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس لمبے سفر میں اس نے جو بھی صعوبتیں جھیلی ہیں وہ دراصل اس کے حصے کی نہیں تھیں۔ اگر وہ اپنے اجداد کے ساتھ مر جاتا تو شاید آنے والی نسلوں میں اپنے غم کو منتقل نہیں کر پاتا۔ وہ جب اپنے پوتوں کو گزرے ہوئے حادثوں کی کہانیاں سناتا ہے تو بچے اس سانحے کو تاریخ سمجھ کر اپنے سینے میں دفن کر لیتے ہیں۔ مگر حادثوں کی کوکھ سے نکل کر ابھرنے والا وہ شخص اسے دھرو ہر مان کر جی رہا تھا۔

لمبی زندگی جینے کے بعد جب وہ ایک بھرے پُرے پریوار کے ساتھ اپنی شاندار عمارت میں جشن منا رہا تھا تو تاریخ پھر دہرائی جاتی ہے۔ یہ وہ تاریخ تھی جو معصوم زندگیوں کا نوحہ بیان کرنے کے لئے زندہ رکھی جاتی ہے۔ یہاں ملبے کے اندر مردہ دادی کی گود میں ایک شیر خوار بچہ بچا لیا جاتا ہے۔ بچہ ایک علامت بنتا ہے۔ قدرت اسے گینی پگ کی طرح استعمال کرتی ہے۔ وہ اپنی لمبی زندگی کے دوران بند کمرے میں اجداد کی موت کا نوحہ کرتا ہے یا رات کی تنہائیوں میں اس کے قدم ڈگمگاتے ہیں یا اپنے جوان بیٹے کی فطری موت دیکھتا ہے یا اپنی کمزور بینائی اور پھولتی

ہوئی سانسوں کے دائرے میں زندہ رہنے کی کوشش کرتا ہے یا وہ دوسرے ناکردہ گناہوں کی سزائیں جھیلتا رہتا ہے تو اسے محض مقدس کتابوں میں ہی شرن لینی پڑتی ہے۔ وہ ان کتابوں سے خود کو الگ رکھنے کے قابل بھی نہیں ہوتا۔ گیانی کی آوازیں دیر تک تعاقب کرتی ہیں۔

'کُل (نسَب) کا وناش ہو جانے پر پرانے چلے آرہے کُل کے دھرم ارتھات (یعنی) ودھان (دستور) نشٹ ہو جاتے ہیں اور ان دھرموں کے نشٹ ہو جانے پر سارے پریوار میں ادھرم پھیل جاتا ہے۔'

مگر یہ کون سا وِدھان تھا کہ دھرم کی بستی میں کُل کے نشٹ ہو جانے کے باوجود اس نے اپنے بھرے پُرے پریوار میں ادھرم نہیں پھیلنے دیا۔ کبھی وِدھاتا کی ڈور سے بندھ کر ڈولتے رہے اور جب جی چاہا ڈور توڑ دی گئی۔ دھرم گرنتھوں کے روشن شبدوں نے تاریکیاں اوڑھ لیں......

حادثہ پھر ہوتا ہے۔ اس بار اور بڑی تباہی آئی ہے۔ کئی یگوں کے بعد پھر اسے وہ منظر یاد آتا ہے، جب زمین لرز رہی ہوتی ہے۔ ہر طرف عمارتوں کے منہدم ہونے کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ حشر بپا ہوا تو اس کے اجداد دیکھتے ہی دیکھتے لقمۂ اجل بن گئے اور وہ اسی طرح ذی ہوش بلکہ اپنی زندگی جی کر اس سانحہ کا حصہ بنتا ہے۔ سب ایک دوسرے سے مدد کی اپیل کر رہے ہیں۔ زمین لگاتار اپنے سینے کو چاک کرتے ہوئے بلند و بالا اشجار اور آسمان کی بلندیوں کو چھوتی ہوئی عمارتوں کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کر رہی ہے۔ بوڑھے کی گود میں اس پریوار کا سب سے خوبصورت اور شیر خوار بچہ چیخنے لگتا ہے۔ وہ بچے کو زور سے اپنے سینے میں چھپا لیتا ہے۔ عمارت منہدم ہو رہی ہے۔ زلزلہ اور تیز ہو رہا ہے۔ ایک ایک کر کے اس کے پریوار کے سبھی افراد دم توڑ دیتے ہیں۔ بوڑھے پر بھی ستون کا کوئی حصہ گر چکا ہے۔ اسے بھی شاید زندہ نہیں رہنا ہے مگر شیر خوار بچہ اب بھی زندہ ہے۔ وہ لگاتار رو رہا ہے۔ بوڑھا جانتا ہے کہ کچھ دیر بعد وہ بھی مرجائے گا کیونکہ اب جینے کی کوئی بھی سبیل باقی نہیں تھی۔ مگر وہ شیر خوار بچے کا کیا کرے؟ وہ

اسے اپنی گود میں چمٹائے رہتا ہے۔ پھر اسے وہ منظر یاد آتا ہے جب اسے ملبے سے نکالا گیا تھا۔ اس نے خودکشی کی بھی کوشش کی تھی لیکن مذہبی کتابوں نے ایسا کرنے سے اسے روک دیا تھا۔ شاید اسے یونہی زندہ دفن ہونے کے لئے بچا رکھا گیا تھا۔ مگر وہ اپنی زندگی تو کسی طرح جی چکا تھا۔ اس بار وہ تاریخ کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ شیر خوار بچہ تمام عمر جی کر اپنے بھرے پرے پریوار کے ساتھ ایک دن مرجائے گا۔ وہ اپنے مکان کے گرتے ہوئے آخری ستون کے سامنے شیر خوار بچے کو رکھ دیتا ہے۔

اس بار بچہ تو مرجاتا ہے مگر بوڑھا زندہ نکال لیا جاتا ہے۔ ■

دیواریں

اکیلا گھر ہے کیوں رہتے ہو، کیا دیتی ہیں دیواریں
یہاں تو ہنسنے والوں کو رلا دیتی ہیں دیواریں

مجھے یاد نہیں کہ وہ کون تھا جس نے ایسا کچھ لکھ کر مجھے کریدنے کی کوشش کی تھی۔ سچ ہے کہ میں نے اپنے وجود کو ان دیواروں میں قید کر رکھا ہے۔ میں کہیں بھی جاتا ہوں تو یہ میرے ساتھ ضرور ہوا کرتی ہیں۔ تم انہیں بھول جاؤ لیکن میں بھلا کیسے بھول سکتا ہوں۔ میں نے انہیں اپنے ساتھ چلتے ہوئے جیتے ہوئے محسوس کیا۔ یہ سب کچھ جانتی ہیں۔ میں ان سے کچھ چھپا بھی نہیں پاتا۔ میرے بستر کی شکن، برستی ہوئی آنکھوں کے ٹوٹے ہوئے خواب، ان پر میری ہتھیلیوں کے نشان اور پھر مجھے خود سے بہت کچھ کہنے کی عادتوں سے بھی یہ واقف ہیں۔

تم نے یہاں جو کچھ آویزاں کر رکھا ہے، یہ ان سے بھی واقف ہیں۔ جیسے کینڈل اسٹینڈ، جدید پینٹنگ اور پھر وقت کا احساس دلانے والی لگاتار ٹِک ٹِک کرتی ہوئی گھڑی۔

تمہیں یاد ہے نا کہ یہ سب کچھ تم نے ہی سجا رکھا تھا۔ میں یا میری دیواروں نے انہیں کبھی خود سے الگ نہیں کیا۔ بلکہ جب کبھی دھول جمنے لگتی ہے تو انہیں پھر سے شفاف کر دیا کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم یہ سب بھول چکی ہو۔ ممکن ہے میں بھی بھول جاتا لیکن کیا کروں یہ دیواریں مجھے زندہ رکھنا چاہتی ہیں۔ یہ بظاہر خود تو خاموش رہتی ہیں مگر مجھے ضرور سنتی ہیں بلکہ تحفظ کا احساس بھی دلاتی ہیں۔

کئی بار ایسا بھی ہوا کہ میں ان سے اوب سا گیا تو انہیں چھوڑ کر میلوں دور چلا گیا۔ سارا دن شہر کے مختلف خطوں میں گھومتا رہا۔ کبھی سمندر، کبھی پہاڑوں، کبھی مصروف ترین شاہراہوں پر...... مگر پھر جب تھکن حاوی ہونے لگی تو مجھے جائے اماں نے پکارا۔ نئی جگہ نئی عمارت نے بھی راحت کا احساس دلایا۔ مگر جیسے ہی بستر پر لیٹا تو پھر بغور چھت کو دیکھنے لگا۔ میں چونک گیا کہ یہاں بھی دیواروں نے ہی چھت کو اپنے دوش پر سجا رکھا تھا۔ دیواریں مجھے دیکھ کر مسکرانے لگیں۔ میلوں لمبی دوری طے کرنے کے بعد بھی یہاں ان کا میرے ساتھ ہونا مجھے چونکنے پر مجبور کرنے کے لئے کافی تھا۔ وہ مجھے اپنے اندر سمیٹتی ہیں بلکہ نیند سے بوجھل ہونے کے لئے مجبور کرتی ہیں۔ تھپکیاں بھی دے جاتی ہیں۔ میں ان سے کیسے دور رہ سکتا ہوں۔ اور پھر مجھے لوٹ جانا پڑتا ہے کہ شاید تم وہاں میرے لئے منتظر ہوگی۔ ممکن ہے تمہارا میرے ساتھ اتنی دوری طے کرنا مناسب نہ ہو مگر اس جگہ کو تم کیسے بھول سکتی ہو جہاں......

ہاں جہاں یہ دیواریں تمہاری راز دار ہوں۔

ان دنوں جب میں بہت رات گئے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا کرتا تھا تو نہ جانے کیسے تمہیں خبر ہو جایا کرتی تھی۔ تم جب کہ مجھ سے خاصی دوری پر بسی ہوئی تھی ہاں میں اپنے گھر سے تمہارے گھر کو صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ میں جب تمہاری راہوں سے دبے پاؤں بھی گزرتا تو تم نہ جانے کیسے میری راہ کو روشن کر دیتیں۔ میرے قدموں کی آہٹوں سے تمہارا کیا رشتہ تھا، مجھے نہیں معلوم۔ لیکن میرے چلے جانے کے بعد تم جب اپنے دروازے کے باہر والے بلب کو پھر سے روشنی سے محروم کر دیا کرتی تھی تو مجھے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ شاید یہ روشنی میرے لئے ہی ہوا کرتی تھی اور پھر جب میں رات گئے اپنے کمرے میں روشنی بکھیرتا تھا تو کچھ دیر بعد تم بھی اپنے کمرے کو روشنی سے منور کر دیتی تھی۔ یہ سلسلہ تب تک جاری رہتا۔ جب تک میں کمرے کو روشن رکھتا۔ میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوا۔ پھر ایک روز تمہارا چھوٹا بھائی میرے پاس آیا۔ مجھے سخت تعجب ہوا کہ آخر میری ضرورت تمہارے گھر والوں کو کیوں آن پڑی ہے۔ حالانکہ بظاہر

تمہاری ماں نے مجھے بلایا تھا کہ اس بار ہولی میں ضرور آنا ہے۔ میں تمہارے گھر گیا۔ مجھے بہت اچھا لگا۔ تمہاری ماں اور تمہارے بابو جی کے چرنوں پر رنگ دھرے۔ تم نے میرے ماتھے پر رنگ ڈال دیا اور میں نے بھی یہ رسم نبھائی کہ ڈھیر سارا رنگ تمہارے ماتھے پر ڈال دیا۔ تم اپنے رنگ سے زیادہ سرخ ہوگئی تھیں۔ مجھے عجیب سا احساس ہوا بلکہ جینے کی خواہش بھی۔ گھر کے سبھی لوگ مجھے بہت اچھے لگے۔ ایسا لگا کہ میں کسی ایسے پریوار کا انگ بن گیا ہوں جو کہیں نہ کہیں میرے اندر چھپا ہوا تھا۔ مجھے ایسا بھی محسوس ہوا کہ بھلے ہی میں تمہارے گھر نہیں جایا کرتا تھا مگر ہمیشہ کسی نہ کسی طور پر تم سبھوں کی گفتگو کا محور بھی رہا کرتا تھا۔ تمہاری ماں نے بتایا تھا کہ وہ میرے بارے میں بہت کچھ جانتی ہیں۔ تمہارے پاپا میری تعریف اس طرح کیا کرتے تھے جیسے کہ میں ان کے لئے کوئی آئیڈیل کردار بن گیا ہوں۔ میرے تنہا رہنے پر سبھی کو خاصی ہمدردی تھی میں کس طرح رہتا ہوں، کھانا کیسے بناتا ہوں۔ کپڑے کیسے دھوتا ہوں اور پھر دفتر میں پوری تندہی کے ساتھ کس طرح کام کرتا ہوں۔ مجھ سے جڑے ہوئے لوگوں کو محض میری تنخواہ سے مطلب تھا اور ہر ماہ انہیں خرچے کے لئے روپے بھیج دینا میرا فرض تھا...... تمہارے گھر والوں نے مجھے ہمیشہ آتے جاتے رہنے کے لئے زور دیا۔ میں جان بوجھ کر رشتہ بڑھانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ شاید میں انہیں نبھا نہ سکوں۔ مگر رشتے تو بے نام ہواؤں کی طرح ہوتے ہیں، انہیں صرف محسوس کیا جاسکتا تھا۔

اب تو میں اس حد تک تمہارے گھر سے جڑ گیا تھا کہ اکثر تمہارے بھائی میرے کمرے میں آکر سو جاتے اور پھر جگہ نہ ملنے پر میں رات گئے تمہارے گھر چلا جاتا۔ تم ایک کمرے میں مجھے سونے کا انتظام کردیا کرتی۔ میں انہیں اپنا حق سمجھتا اور تم میری توجہ کا مرکز بنتی رہی۔ اب میری تنخواہ پر تمہارے گھر والوں کا بھی حق ہوگیا تھا۔ حالانکہ اس سے کاروباری سطح پر مجھ سے جڑے ہوئے لوگوں میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا کیونکہ میں نے انہیں کوئی کمی نہیں ہونے دی تھی۔ اب اکثر میں رات گئے لوٹنے لگتا تو تمہاری ماں خصوصی طور پر تنبیہ کرتیں کہ اتنی رات گئے مجھے

اپنے گھر نہیں لوٹنا ہے اور میں ان کی بات مان لیتا اور پھر تمہارے گھر کے اس مخصوص کمرے میں ہی سو جاتا۔ مگر رات کے پچھلے پہر تم کمرے کو روشن کرنے کے بعد مجھے جگا دیتی۔ میں بہت سہم جاتا کہ تمہارے گھر والے ہمارے بارے میں کہیں کچھ سوچ نہ لیں۔ میں نے تمہیں بہت سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر تم نے ایک نہ مانی اور نہ جانے کیوں تم اپنا سب کچھ مجھے سونپنے کے لئے پریشان تھیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ رشتوں کی آنچ مدھم ہو جائے اسی لئے کسی نہ کسی بہانے سے تم سے دور رہنے لگا، بہت دور۔ مگر مجھے پاس والے دفتر میں نوکری کرنی تھی۔ اسی دفتر میں جہاں تمہارے پاپا بھی لائبریرین کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اب تو ایسا بھی ہونے لگا تھا کہ جب دو تین دنوں تک لگاتار تمہارے گھر نہیں جاتا تو تمہارے پاپا حکم صادر کرتے کہ تمہاری ماں نے مجھے بلایا ہے۔ میرے دل میں ان کے لئے بے حد احترام تھا۔ مجھے مجبوراً جانا بھی پڑتا۔ تب تمہارے گھر والوں سے زیادہ تمہاری ناراضگی مجھے جھیلنی پڑتی۔ تم جب خود سے نہیں کہہ پاتی تھی تو تفصیلی خط لکھ کر بتا دیا کرتی۔ میں کیا کرتا۔ میں نے تم سے کہیں کچھ بھی نہیں چھپایا تھا اور نہ ہی کوئی آئیڈیل کردار بننا چاہتا تھا۔ میرا ماضی، میرا حال سب کچھ تمہارے سامنے تھا تو پھر میں ہی تمہاری چاہتوں کا مرکز کیوں بنا نہیں جانتا تھا۔

کبھی کبھی تو میں نے یہ بھی کوشش کی تھی کہ اس شہر سے کہیں دور چلا جاؤں۔ مگر بہت جد وجہد کے بعد حاصل کی ہوئی اس نوکری کو چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں خود سے جڑے ہوئے لوگوں کو بھی کسی پریشانی میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ میں سخت ذہنی الجھنوں میں تھا۔ میں اپنی تنہائی سے بھی بہت کچھ چھپانے کی کوشش کرتا مگر جہاں یہ تنہائیاں رہا کرتی تھیں وہاں دیواروں سے ان کا اٹوٹ رشتہ تھا۔ اور تب پہلی بار میں نے سب کچھ ان دیواروں سے کہہ ڈالا۔ دیواریں خاموش تھیں اور میں ان کی خاموشی سے قدرے سکون بھی محسوس کر رہا تھا کہ تم میرے دروازے پر بھی دستک دینے لگی۔ پہلی بار جب تم میرے کمرے میں آئی تو میں بہت خوفزدہ ہو گیا۔ مگر جب تمہارا یہاں آنا تمہارے گھر والوں کو برا نہیں لگا تو میں نے تمہارے رشتے کو ایک نام دینے

کی کوشش کی۔ اب میں اپنے کمرے کی چابی دفتر جاتے ہوئے تمہارے گھر پر ہی رکھ دیا کرتا۔ اس دوران تمہارے بھائی یا کبھی کبھی تمہاری ماں اور سب سے زیادہ تم میرے کمرے میں آکر ساری چیزوں کو قرینے سے سجا دیا کرتیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرے کمرے میں تم نے جدید پینٹنگ، گھڑی، گلدان اور نہ جانے کیا کچھ لاکر سجا دیا۔ مجھے یہ سب بہت اچھا لگا۔ ایک بکھرے ہوئے گھر کو تم نے سنوارنے کی کوشش کی۔ مجھے یہ کمرا بہت پیارا لگنے لگا۔ بلکہ یہاں تمہاری شدت سے کمی بھی محسوس کرنے لگا۔ اور پھر اسی دوران تم نے میرے کمرے کی دیواروں کے سامنے ایک مستحکم رشتے سے مجھے جکڑ لیا اور اسی شدت نے مجھ میں ایک جنون سا بھر ڈالا ایک تعمیری جنون۔ میں نے تمہارے اعتماد کو اپنے اندر سمیٹ کر اپنے عبرت ناک ماضی کو کہیں دفن کر ڈالا اور اپنی بے ترتیب زندگی کو جینے کا نیا انداز دینے کی کوشش کی۔ میں اس میں کامیاب بھی ہوا۔ لگاتار میں نے ترقی کی کئی منزلیں طے کرلیں۔ کیونکہ ان الجھنوں میں تم میرے ساتھ تھی۔ مگر جیسے جیسے میں نے خود کو تمہارے جسم کی سرحدوں سے دور کیا اور روح کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کی تو نہ جانے کیوں تم مجھ سے دور ہونے لگی۔ میرے لئے جسم کی حدود کی قطعی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی کیونکہ ایسے رشتوں کی شدت لمحاتی ہوا کرتی ہے۔ اور پھر ایسا بھی ہوتا رہا کہ اسی جذبے نے کاروبارِ شوق کو سطحی بنا رکھا ہے۔

تم نے جس موڑ پر تنہا چھوڑ دیا اس موڑ سے آج بھی کئی راستے تمہارے گھر کی طرف جاتے ہیں۔ میں کوئی اور راہ بھی اختیار کرسکتا تھا۔ مگر اپنے تاریک راستوں پر تمہارے گھر سے پھوٹتی ہوئی روشنی کو نہ دیکھ کر اکثر میں اپنے گھر تنہا لوٹ جایا کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اگر اب تک میں تمہارے ساتھ اپنے بستر کی شکن کو زندہ رکھتا تو تم مجھ سے دور نہیں رہ پاتی۔ تمہاری تحریروں میں نہ جانے آج بھی کیوں امید کی پھیلی ہوئی کرن ہے۔ تم کہیں اور مصروف ہوگئی ہو۔ میں تمہیں، تمہاری دنیا سے لوٹنے کے لئے نہیں کہتا۔ لیکن دیواروں پر آویزاں تمہاری یادوں کو بھی خود سے الگ نہیں کر پا رہا ہوں۔

تمہیں اب کبھی نہیں لوٹنا ہے۔

اب تمہیں لوٹنا بھی نہیں چاہئے کیونکہ تم نے جونئی دنیا بسائی ہے وہاں بھی تم بہت ساری امیدوں کا مسکن ہو۔ میں نے ان دیواروں سے اپنا اٹوٹ رشتہ قائم کرلیا ہے۔ میں انہیں سب کچھ کہہ سکتا ہوں۔ شاید وہ بھی، جوتم آج تک نہیں جان پائی ہو۔ اور یہی ایک آستھا ہے جو مجھے زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔

اب ایسے میں وہ نئی لڑکی رجنی بالکل میرے پاس آگئی ہے۔ وہ ہے ایک خوشبو۔ ایسی ایسی خوشبو جسے شاید کوئی بھی محسوس کئے بنا نہیں رہ سکتا۔ میں اسے دیر تک سنتا ہوں۔ بلکہ آنکھیں بند کر کے جینے کی بھی کوشش کرتا ہوں۔ مگر یہ سب کچھ میرے کمرے سے باہر ہی ہوا کرتا ہے۔ رجنی......! بالکل ہی الگ ہے۔ شاید وہ بھی رشتوں کی حقیقتوں سے بخوبی واقف ہے۔ اس لئے وہ کسی وعدے کسی امید کسی کاغذی پیراہن پر یقین نہیں رکھتی۔ وہ رشتے کو ایک اور نام دینا چاہتی ہے۔ وہ کوئی خواب نہیں سجاتی۔ بس تعبیر ہی بنتی ہے۔ مجھے اپنی زندگی کے اس موڑ پر اس کا ایسے مل جانا بہت اچھا لگا ہے۔

رجنی جانتی ہے کہ دیواریں تو ہمیں الگ بھی کرتی ہیں۔ ممکن ہے وہ جو کچھ سوچ رہی ہے سہی ہو۔ مگر میں اپنے کمرے کی بکھری ہوئی آستھاؤں کو توڑ بھی نہیں سکتا۔

رجنی یہ سچ ہے کہ تم میرے لئے آسمان تو ہوسکی ہو، میرا گھر نہیں۔ ■

ریت پر ٹھہری ہوئی شام

ریگستان چپ تھا۔

شام ہو چکی تھی۔ رُکسنا اب تک اپنی ڈھانی میں نہیں لوٹا تھا۔ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ رُکسنا کے آنے سے پہلے دور سے بکریوں، بھیڑوں کی آوازیں مل جایا کرتی تھیں۔ آج تو جیسے دور دور تک خاموشی چھائی تھی۔ ایسی خاموشی جو ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ کاش! بہت دور سے ہی سہی رُکسنا کے گانے کی آواز ہی مل جاتی مگر ایسا بھی کہاں ہو پا رہا تھا۔

کچھ اور اندھیرا ہوا تو مایوسی بھی بڑھنے لگی۔

رُکسنا کی پتنی پھولی ٹیلے کی طرف دھیرے دھیرے بڑھنے لگی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ رُکسنا دور سے دوڑتا ہوا آیا کرتا تھا۔ پھولی اسے آتے دیکھ کر ہی تھالی پروسنے کی تیاری شروع کر دیا کرتی تھی۔ ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو وہ چلّانے لگتا۔

ڈھانیوں یعنی چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں میں بسے ہوئے لوگ عام طور پر چرواہے ہوا کرتے ہیں۔ اونٹ بکریاں یا بھیڑیں، ان کی زندگی کا خاص حصہ ہیں۔ ان کا ذریعہ معاش بھی یہی ہے، اونٹ کی سواری ہو، بھیڑ کا اون یا بکری کا دودھ۔ ریگستانی علاقوں میں دور دور پر دو چار گھروں کی چھوٹی چھوٹی آماجگاہیں ہوا کرتی ہیں۔ دراصل ان کا تصور بستی سے الگ ہے۔ ایک سے زیادہ

بسے ہوئے جھونپڑوں میں رہنے والے مکینوں کی وہ ڈھانی ہوتی ہے۔ ڈھانی یعنی چھوٹی سی بستی۔
ان ہی ڈھانیوں میں ایک اور شخص ہوا کرتا ہے وہ بھی اب تک نہیں لوٹا ہے۔ امیرا۔

ہاں یہ وہی امیرا ہے جو پہلے بھی دو دن یا تین دن کے بعد لوٹتا رہا ہے۔ امیرا اکیلے ڈھانی سے نکلتا تھا۔ شہر میں کہیں کام کرتا تھا۔ کچھ کمانے کے بعد لوٹ آیا کرتا تھا۔ وہ بھی پہلے بھیڑ بکریوں کو لے کر نکلا کرتا تھا۔ مگر اب ایسی بات نہیں تھی۔ رِکسنا اور امیرا گہرے دوست تھے۔ پہلے ساتھ ساتھ نکلا کرتے تھے پھر ساتھ ہی لوٹتے۔ مگر قحط پڑنے کے بعد امیرا ایک دم ٹوٹ گیا۔ اس نے رِکسنا کو بھی سمجھایا تھا کہ شہر میں جا کر بس جائے۔ وہیں کوئی کام کرے۔ مگر یہ سب اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ ڈھانیوں کے لوگ تو ایسے اکال کے عادی ہو چکے تھے۔ مصیبت کا جم کر مقابلہ کرتے تھے۔ پھر کوئی نہ کوئی راستہ نکل آتا۔ اور اخیر میں مویشی ہی کام آتے۔ امیرا اور کسنا میں یہی فرق تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے کسنا شام ہوتے ہی گھر لوٹ آیا کرتا تھا۔ امیرا نے کوئی اور راہ اختیار کر لی تھی اس لئے سبھی اس کی عادتوں سے واقف ہو چکے تھے مگر کسنا کے لئے بے چینی تو فطری تھی۔

تھک ہار کر رِکسنا کی پتنی پھولی دور تک پھیلی ہوئی ریت کے ٹیلے پر بیٹھ جاتی ہے۔ ہاتھ میں ایک چھڑی ہے۔ گھونگھٹ کے اندر سے اس کی آنکھیں جیسے بھٹکے ہوئے مسافروں کے لئے روشنی کا کام کر رہی ہوتیں۔ وہ جانتی ہے کہ رِکسنا ضرور آئے گا۔ کوئی مجبوری ہوگی۔ مگر من تو کہاں مانتا ہے۔ من پھولی کی آنکھوں سا چنچل ہے۔ اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد پھر ایک جگہ پر ٹِک جاتا ہے۔

پھولی آس پاس کی ڈھانیوں میں رہنے والی عورتوں سے بالکل الگ تھی۔ انتہائی خوبصورت ہونے کے باوجود من کی بھی اتنی کومل تھی کہ کبھی کبھی ریگستان پر ہرے بھرے موسموں کا گمان ہونے لگتا تھا۔ کسنا کا پریم بھی عجیب تھا وہ پھولی کے لئے بہت کچھ کرنا چاہتا تھا اور یہ بھی کوشش ہوتی تھی کہ وہ کچھ ہونے سے پہلے جان بھی نہ پائے۔ اسی لئے رعب اور دبدبہ بھی

قائم رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ پھولی رات میں تھکی ہاری جب بستر پر آتی تو کسنا دھیرے دھیرے اسے اس طرح اپنی بانہوں میں سمیٹتا کہ وہ تھکن کے احساس کو بھول جائے اور سچ مچ ایسا ہی ہوجایا کرتا۔ کسنا کے چھوتے ہی پھولی میں نہ جانے کہاں سے شگفتگی آجاتی ۔لرزتے ہونٹوں پر کسنا کی انگلیوں کے لمس سے پورا جسم ایک بے نام حرارت سے بھر جایا کرتا۔ کسنا کو جب محسوس ہوتا کہ پھولی گج گامنی بن چکی ہے تو وہ دھیرے دھیرے شِو کی آرادھنا میں کھونے لگتا۔ اسے ایک نئی دنیا نظر آنے لگتی۔ پھولی صرف کسنا کے لئے دودھیا چاندنی اور ٹھنڈی ریت پر رقص کرتی نظر آتی۔ بس اس کے چاروں طرف کسنا کا تیج بھرا چہرہ اور چمکتا ہوا شریر ہوتا وہ اپنے تن کے گہنوں کو اتار کر کسنا کے شریر کو اپنی ہر مدرا کا انگ بنالیتی۔ پورے طور پر کسنا کو تھکا دینے کے بعد پھولی دیر تک کھلکھلاتی رہتی۔ وہ پھر جاگ جاتا اور اس بار شِو کی آرادھنا کچھ یوں کرتا کہ پھولی پورے طور پر اس میں سماجاتی اور اپنے اندر کسی رچنا کے خوبصورت تصور میں کھوجاتی۔

سچ مچ شِو جی کی کرپا ہوجاتی ہے۔ آرادھنا سپھل ہوتی ہے اور ایک پیاری سی بچی دھاپو ان کی زندگی میں لگاتار گونجنے والی کلکاری بن کر آتی ہے۔ دھاپو کے آنے سے دونوں بہت خوش تھے۔ جینے کا سچ مچ ایک خوبصورت مقصد بھی مل گیا تھا۔ کسنا اور پھولی کے پریم کے بیچ وہ کب چھ سال کی ہوگئی، پتہ بھی نہیں چلا۔ لیکن تب تھوڑی ذمہ داری کا احساس ضرور بڑھنے لگا اب چاہ کر بھی شِو کی آرادھنا کے دوران دھیرج رکھنے میں اسے کامیابی نہیں مل پارہی تھی۔ پھولی کہتی کہ تم اُدھیر ہوگئے ہو۔ اس میں کسنا کا قصور بھی نہیں تھا کیونکہ اسے دھوپ کا پربت کاٹنے کے لئے صبح جلدی جگنا ہی تھا۔ ظاہر ہے کہ چنتا تو روز نئے راستے بناتی رہتی ہے۔ کوئی فیصلہ کرنا بھی آسان نہیں ہوتا۔ من کو بھی آخر کوئی کیسے سمجھائے۔

وہ ایسے ہی اُدھیڑ بُن میں تھی تب ہی اس کے جھونپڑے سے دھاپو کے رونے کی آواز ملتی ہے۔ پھولی اچانک بیٹی کو روتے ہوئے سن کر اور بے چین ہوجاتی ہے۔ وہ دوڑتی ہوئی اس کے پاس پہنچتی ہے۔ شام ہوتے ہی سوجانے والی دھاپو کا ایسے جاگ جانا اسے اچھا نہیں

لگا۔ وہ اسے چپ کراتی ہے۔ پھر کسی طرح سلا دیتی ہے۔ اندھیرا اور گہرا ہو رہا تھا۔ وہ روشنی کرنا بھول گئی تھی۔ پھر اٹھتی ہے اور جیسے ہی روشنی کرتی ہے کہ ٹیلے کے اس پار سے کسی کے آنے کی آواز ملتی ہے۔ پھر دھیرے دھیرے بکریوں بھیڑوں کی آوازیں صاف سنائی دینے لگتی ہیں۔ ایسے میں اسے محسوس ہوا کہ اچانک چاروں طرف روشنی پھیل گئی ہے۔ وہ اپنے آپ کو روک نہیں پائی۔ دوڑتی ہوئی پھر ٹیلے کی طرف بڑھنے لگی۔ دیکھتی ہے بھیڑ بکریوں کا جھنڈ دھیرے دھیرے اس کی طرف آ رہا ہے۔ ہاں ان کے پیچھے پیچھے بھی کوئی ہے۔ رکسنا کے سوا کون ہو سکتا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے سبھی جانور اس کے پاس سے گزرتے رہے۔ جب سب ڈھانی کی طرف چلے گئے تو ان کی آوازوں سے دھاپو پھر جاگ جاتی ہے۔ دھاپو اپنی پیاری بکری روپل کو چومنے لگتی ہے۔ اس سے شکایت بھی کرتی ہے کہ کاہے آنے میں دیر لگا دی۔

مگر یہ کیا پھولی تو ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔ مویشی تو لوٹ آئے مگر رکسنا نہیں لوٹا تھا۔ بلکہ رکسنا کی جگہ امیرا انہیں لے کر آیا تھا۔ امیرا پاس میں بیٹھ گیا۔ پھولی ہمت نہیں جٹا پا رہی تھی کہ کچھ پوچھے۔ مگر امیرا نے اسے بتایا کہ آج اگر وہ وقت پر ہاٹ میں نہیں پہنچتا تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔

ہوا یہ تھا کہ ان دنوں رکسنا بہت پریشان تھا۔ چاروں طرف چارے کا نام و نشان نہ تھا۔ وہ کب تک انہیں دور دور تک لے جاتا یا پھر چارے کا انتظام کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ تنگ آ کر اس نے سوچا کہ ان سب مویشیوں کو بیچ کر کوئی نیا کام کرے گا۔ یہی سوچ کر وہ ہاٹ گیا۔ مگر امیرا کے وہاں پہنچنے پر اس کا مقصد پورا نہیں ہو سکا۔ امیرا نے اسے بتایا کہ ہم ایسا کرنے کے بعد بہت پچھتا رہے ہیں۔ پہلے تو لگتا تھا کہ ہم ان کے مالک بھی ہیں۔ اپنا کاروبار ہے۔ جو چاہے کر سکتے ہیں۔ مگر اب تو جیون نرک بن گیا ہے۔ بارہ چودہ گھنٹہ کام کرنے پر بھی بھکاری کی طرح مزدوری کے لئے نیچے گرنا پڑتا ہے۔ امیرا کی حالت دیکھ کر رکسنا نے ارادہ تو بدل دیا لیکن وہ اسے بھیڑ بکریوں کو دے کر جانے کہاں چلا گیا۔

پھولی سب کچھ جان کر چپ ہوگئی۔ امیرا نے اسے جھونپڑی میں جاکر آرام کرنے کے لئے کہا۔ یہ بھی بولا کہ من ٹھیک ہونے پر وہ آجائے گا۔ مگر پھولی کچھ نہ بولی۔ امیرا اپنی ڈھانی میں چلا گیا۔ پھولی اسی جگہ بیٹھی رہی۔ ریت دھیرے دھیرے اور ٹھنڈی ہورہی تھی۔ اپنی بکری روپل کے ساتھ کچھ دیر بعد دھاپو بھی وہاں پر آگئی۔ ماں کی گود میں سر رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ پھولی دھیرے دھیرے دھاپو کو تھپکیاں دیتی ہے۔ پھر اپنے آپ کچھ گنگنانے بھی لگتی ہے۔ یہ سلسلہ دیر تک جاری رہتا ہے۔ دھیرے دھیرے اس کی آنکھوں کی چمک پانی میں ڈوبنے لگتی ہے۔

کب سورج کی پہلی کرن ابھری۔ یہ تو پھولی نہیں جان پائی۔ دھاپو نے اسے جگایا۔ زور زور سے چلائی تو اس کی آنکھیں کھلیں۔ کیا دیکھتی ہے کہ رِکسنا اونٹ گاڑی پر ڈھیروں چارہ لادے ہوئے آرہا ہے۔ دھاپو دوڑ کر باپو کے پاس جاتی ہے۔ پھر رِکسنا کی پیٹھ پر سوار ہوجاتی ہے۔ رِکسنا اسے پیار کرنے لگتا ہے۔ پھولی پلو میں منہ چھپائے ہوئے اپنی ڈھانی میں چلی جاتی ہے۔ جلدی جلدی چولہا جلاتی ہے۔ پھر روٹی سینکتی ہے۔ رِکسنا کے لوٹنے پر بھیڑ بکریوں کا شور بھی بڑھ جاتا ہے۔

کچھ دیر بعد رِکسنا بھی جانوروں کو چارہ ڈال رہا ہوتا ہے۔ دھاپو ایک بکری کے تھن میں منہ لگا کر دودھ پینا چاہتی ہے۔ رِکسنا پیار سے دھاپو کو اپنی گود میں بھر لیتا ہے۔ پھر خود ہی بکری کے تھن میں ہاتھ لگا کر دھاپو کے چہرے پر کچھ دیر تک دودھ کی دھار بہانے لگتا ہے۔ دھاپو للچاتی ہے۔ مگر جلد ہی دودھ اس کے منہ میں جانے لگتا ہے۔ رِکسنا لگاتار ہنستا جاتا ہے۔ پھولی بھی یہ سب دیکھ کر کھلکھلاتی ہے۔ مگر ہنستے ہوئے نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ ■

رات

وہ پھر آ گئی۔

میرے سرہانے بیٹھ گئی۔ میں اسے محسوس کرنے لگا۔ مگر اپنی آنکھیں بند کئے تھا۔ وہ سمجھ لے کہ میں سو چکا ہوں یا پھر سونا چاہتا ہوں۔ وہ جانتی تھی کہ میں اس کے بغیر سو نہیں سکتا۔ وہ مجھے تھپکیاں دیتی ہے مگر دھیرے دھیرے کچھ بولتی ضرور ہے۔ اس کی سرگوشیوں کو میں سنتا ہوں۔ مگر جان بوجھ کر کوئی جواب نہیں دیتا۔ میرے جواب سے پھر نئے سوالوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوسکتا تھا۔ وہ ایک طرح سے دھیرے دھیرے میرے وجود پر حاوی ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ آج پھر وہی ہوا جو روز ہوا کرتا تھا۔ اسی سوال نے پھر چھیڑا۔

'سو گئے کیا......؟'

خاموشی......

'میں پوچھ رہی ہوں سو گئے کیا؟'

پھر خاموشی......

'میں سمجھ گئی۔ اب تم پھر وہی چاہ رہے ہو! مگر جان لو ایسا کچھ بھی نہیں کرنے والی ہوں۔ تم خود مجھے جگاؤ گے اور میں بھی سونے کی مُدرا میں تمہارے سامنے اوندھے پڑی رہوں گی...... سوچ لو...... پھر ایسا ہوا تو تم ساری رات سو نہیں پاؤ گے......۔ میں کچھ بول رہی

ہوں...... تم سن بھی رہے ہو یا نہیں؟ ...... کہیں ایسا تو نہیں کہ تم سچ مچ سو گئے! مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے میرے بغیر تمہیں نیند کیسے آسکتی ہے؟ ...... اوہ سنو! اٹھو بھی ورنہ میں رونے لگوں گی اور تم تمام رات مجھے چپ کرواتے رہنا۔ اور اگر میں سو گئی تو تمہیں جاگتے ہی رہنا ہوگا۔ ٹھیک ہے جاؤ میں آج سے تمہیں پریشان نہیں کروں گی۔ تمہیں جو اچھا لگے وہی کرو۔ اگر میرے بغیر بھی سونے میں کامیاب ہو جاؤ گے تو میں تمہاری زندگی سے بہت دور چلی جاؤں گی۔ بس آخری بار کہہ رہی ہوں تم مجھ سے بات کرو گے یا نہیں؟'

وہ بولتی رہی۔ میں سنتا رہا۔ آج میرا یہ ارادہ تھا کہ کیا وہ سچ مچ مجھ سے ناراض بھی ہو سکتی ہے؟ کیا وہ تھک کر سو جائے گی یا پھر مجھے جگانے کے لئے کوئی اور حربہ استعمال کرے گی۔ میں بدستور خاموش رہا۔ وہ بھی چپ ہو گئی۔ اس نے کچھ اور کر گزرنے کے لئے شاید سوچنا شروع کر دیا تھا۔ مگر دیر تک خاموشی پسری رہی تو میں بے چین ہو گیا۔ اس کے رونے سسکنے یا چھیڑنے کی آواز نہیں ملی تو میں چونک کر اٹھ گیا۔ ارے یہ کیا؟ وہ ابھی میرے پاس تھی اور اچانک غائب بھی ہو گئی۔ میں نے اٹھ کر کمرے کی کھڑکی کھولی۔ باہر دور دور تک کوئی نظر نہیں آیا۔ چاروں طرف شہر روشنی میں نہایا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی اکا دُکا گاڑیوں کے آنے جانے کا سلسلہ ضرور قائم تھا۔ میرا چھوٹا سا کمرہ ہے۔ یہی میری کائنات ہے۔ اس سے باہر تو یہ بڑا شہر ہے جو ساری رات جاگتا ہی رہتا ہے۔ پھر اپنی تشفی کے لئے میں اسے اِدھر اُدھر تلاش کرنے لگا۔ پھر کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ ارے یہ تو اندر سے بند ہے؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کہیں آس پاس ہی چھپی ہے۔ میں جانتا ہوں، کچھ دیر بعد وہ کہیں سے نمودار ہو گی اور میری آنکھیں اس کی انگلیوں کے لمس کو محسوس کریں گی۔

میں نے کچھ دیر اس کا انتظار کیا۔ پھر سوچنے لگا کہ میرے کمرے کا دروازہ تو عجیب ہے میں باہر جا کر اسے اندر سے بھی بند کرتا رہا ہوں۔ بس آسان طریقہ ہے کہ باہر سے اندر کی

طرف تھوڑا سا جھٹکا دینا پڑتا ہے اور وہ اندر سے بند ہو جاتا ہے۔ خاموشی اندر قید ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ بھی میری راز دار ہے۔ اس نے بھی ایسا ہی کیا ہوگا۔

مگر میں نے دروازہ بند ہونے کی آواز بھی نہیں سنی۔ آخر وہ اس طرح کیسے جا سکتی ہے۔ جو بھی ہوا ہو مگر وہ کمرے میں نہیں ہے۔ یہ مجھے یقین ہو چلا تھا۔ پھر بھی اپنے آپ کو مزید مطمئن کرنے کے لئے میں نے اسے آواز دی۔

'نشا...... نشا...... ارے کہاں ہو؟ لو میں جاگ گیا...... سن رہی ہو؟'

پھر بھی خاموشی پسری رہی۔ میں نے دوبارہ آواز دی۔

'دیکھو زیادہ پریشان مت کرو۔ اب آ بھی جاؤ۔ میں تم سے ہی کہہ رہا ہوں، نہیں آؤ گی تو میں اب تمہیں بلانے والا نہیں ہوں...... یار...... تھک جاتا ہوں۔ ذرا سوچو! دن بھر کڑی محنت۔ شور شرابہ۔ آخر میں بھی آدمی ہوں...... مشین تو بن نہیں سکتا۔'

اسی دوران اس کے کھلکھلانے کی آواز ملی۔ میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ آواز خامشی میں گونج رہی تھی۔ مگر یہ کیا؟ یہ آواز کمرے کے اندر سے نہیں آ رہی تھی۔ یہ باہر کی آواز تھی۔ اف! یہ لڑکی بھی خوب ہے۔ اب یہ ساری رات مجھے پریشان کرے گی۔ باہر میں اسے تنہا بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ نہ یہ شہر ایسا ہے اور نہ ہی میرا گھر اتنا بڑا ہے کہ وہ کسی گوشے میں جا کر چھپ جائے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں اسے پھر آواز دیتا ہوں۔

'نشا...... نشا...... پلیز...... پریشان مت کرو۔ اچھا چلو۔ تم جیسا کہو گی۔ میں ویسا ہی کروں گا۔ بس ہو گیا نا! اب آ بھی جاؤ......'

اس بار پھر اس کے زور سے ہنسنے کی آواز ملتی ہے۔ مگر دوری کا احساس بھی شدید ہوتا ہے۔ شاید وہ سڑک پر نکل گئی ہے یا پھر کہے گی کہ چلو سمندر کے کنارے چل کر بیٹھتے ہیں۔ پھر تین چار گھنٹے کی فرصت ہے۔

جہاں دن بھر دھوپ کا پربت کاٹنا پڑتا ہے بھلا ایسے شہر میں، سمندر کیوں ہوتا ہے۔ سمندر نہیں ہوتا تو لوگ رات کی بانہوں میں سو تو سکتے تھے۔ مگر اس نے تو رات کو بھی اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ اس کے ہنسنے کی آواز اور دور ہوتی چلی جاتی ہے مگر گونج بتدریج جاری ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں اسے دور جاتے ہوئے بھی سن رہا ہوں۔

اب اسے تنہا تو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میں اپنے کمرے سے نکلا۔ دروازہ کو اس بار باہر سے مقفل کیا اور نشا کا تعاقب کرنے لگا۔ سنسان سڑک پر کبھی لاری آتی ہے کبھی جاتی ہے۔ سڑک اتنی شفاف ہے اور روشنی تیز کہ کوئی دیر تک اندھیرا اپنی آنکھوں میں سموئے نہیں رکھ سکتا تھا۔

میں نے دور دور تک دیکھا۔ مگر نشا کا نام ونشان نہ تھا۔ اب اس کے ہنسنے کی آواز بھی نہیں مل رہی تھی۔ میں سمجھ گیا وہ سمندر کے کنارے جا کر بیٹھ گئی ہوگی۔ چاندنی رات میں وہ دیر تک سمندر کی لہروں کو دیکھتی ہے۔ کبھی کبھی وہ موجوں سے چھیڑ چھاڑ بھی کرتی ہے۔

مجھے معلوم ہے وہ کہاں جا کر بیٹھ گئی ہوگی۔ بس ایک ہی تو پتھر ہے۔ اس پر نہ جانے میں نے کتنی تصویریں اتاری ہیں۔ وہ ان کا ذکر ضرور چھیڑتی ہے۔ اس پتھر سے وہ کبھی کبھی چھلانگ بھی لگا دیتی ہے مگر ساحل کی ریت پر ہی گرتی ہے۔ گیلی ریت پر۔

میں چلتے چلتے تھک گیا تھا۔ اب ساحل پر پڑا ہوا پتھر ایک دم پاس تھا۔ میں نے ہمت کی اور چپ چاپ وہاں جا کر بیٹھ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ یہاں ضرور آئے گی۔ یہی چاہتی بھی تھی وہ۔ اب اس کی باتیں سننے کے لئے بھی تیار ہونا پڑے گا۔

میں پتھر پر جا کر بیٹھ گیا۔ آج لہریں بہت تیز تھیں۔ رات کے اس موڑ پر بھی سمندر تا حد نظر پھیلا ہوا نظر آرہا تھا۔ لہریں کناروں پر آکر بکھر جاتیں تو ان میں بجلی جیسی چمک بھی نمودار ہوتی۔ یہ ایک طرح سے نور کا جھما کا ہوا کرتا تھا۔ آج بھی ایسا ہی تھا۔ بلکہ آج تو کنارے ان لہروں سے ہی روشن ہو رہے تھے۔ مگر اس خوبصورت منظر سے نشا گھبرا جایا کرتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ کہیں لہروں سے کوندتی ہوئی بجلی اس کے وجود پر حاوی نہ ہو جائے۔ میں اسے یقین دلایا

کرتا تھا کہ جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

یہ سب سوچتے ہوئے کچھ دیر بعد میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ سمندر کا شور اور تیز ہونے لگا۔ پھر جیسے ہی لمحہ کچھ ساکت ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ نشا نے میرے شانے پر اپنا سر رکھ دیا ہے۔ وہ زور زور سے سانسیں لے رہی ہے۔ میں نے اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ مگر نہ جانے کیوں خود بخود فرط جذبات سے بولنے لگا۔

'نشا......! اب اتنا پریشان مت کرو۔ تم جانتی ہو کہ میں تمہارے بغیر کچھ سوچ ہی نہیں سکتا۔ دن بھر اسی امید میں گزارتا ہوں کہ رات آنے پر تم میرے ساتھ ہوگی مگر ایسا بھی کیا کہ اب یہ رات بھی میری اپنی نہیں رہی۔ تم نے ایک روز کہا تھا کہ میں نشا ہوں......یعنی رات!! تو پھر روشنی میں کیوں ڈوب جاتی ہو نشا......! چلو اب میں تم سے کوئی شکایت نہیں کرتا۔ میں نے بھی یہ سوچنا چھوڑ دیا ہے کہ مجھے ٹوٹ کر چاہنے والی تم! اب کسی اور کی ہوچکی ہے۔ بہت خوبصورت زندگی گزار رہی ہو۔ تمہارے دو پیارے پیارے بچے بھی ہیں نشا......! میں دن بھر لوگوں کو خوب ہنسایا کرتا ہوں۔ کسی کو تھکن کا احساس نہیں ہونے دیتا۔ مگر رات تو میری اپنی ہے۔ تمہاری یادوں کے سوا میرے پاس اور ہے بھی کیا۔ میں کسی کو بے وفا نہیں کہتا۔ تم تو میری اپنی ہو۔ بھلا تمہیں کیسے رسوا کرسکتا ہوں۔ نشا! تم میرے کمرے سے نکل کر یوں باہر مت آیا کرو۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ راز دنیا بھی جان لے......'

میں دیر تک یوں ہی بولتا رہا۔ وہ سنتی رہی۔ کبھی کبھی سسکتی بھی ہے۔ آہیں بھرتی ہے اور جب وہ خاموش ہو جاتی ہے تو میرا چہرہ کسی تمازت سے تپنے لگتا ہے۔

میں آنکھیں کھولتا ہوں۔ موجیں تیزی سے میری طرف آرہی ہوتی ہیں اور صبح ہونے کا گمان بھی ہونے لگتا ہے۔

میں اپنے شانے پر دھیرے سے ہاتھ رکھتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ نشا جا چکی ہے۔ ■

پھانس

میں گہری نیند میں تھا۔ اچانک جگ گیا۔ شاید کوئی آہٹ تھی یا پھر کسی کی آواز۔ سنا کچھ بھی نہیں تھا۔ بس قیاس کے اندھے کنویں میں بھٹک رہا تھا۔ ممکن ہے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی آنکھوں پر کسی تیز روشنی کا حملہ ہوا ہو۔ روشنی ہی شب خون مارنا چاہتی ہو۔ مگر کچھ تو ہوا تھا۔ یوں ہی دن بھر کا تھکا ہوا کوئی شخص جاگ نہیں سکتا تھا۔ بلکہ دل کی دھڑکنیں بھی بہت تیز ہو گئی تھیں۔ انھیں سنبھال پانا بھی مشکل تھا۔ یہ بھی گمان ہوا کہ اچانک پھر کسی نے بے وقت دل پر دستک تو نہیں دی تھی۔ حالانکہ اُسے روز سونے سے پہلے یاد کرتا ہوں۔ پتہ نہیں کب سے یہ سلسلہ قائم ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شاید کل کی ہی بات ہے۔

'اوہ! نو... وھاٹ آر یو ڈوئنگ'؟

'نتھنگ! اچھا بتاؤ کیا ہوا'؟

'تم اپنے دل سے پوچھو...'

'دل سے ہی پوچھ رہا ہوں...'

'یو آر ناٹی'

'سو تو ہوں...'

'اچھا اب چھوڑو بھی...'

'کیوں'

'دیر ہورہی ہے۔ آئی ایم سُولیٹ'

'کمال ہے محض دو سال کی ملاقات ہے ابھی، اور ان دو برسوں میں تم نے مجھے صرف ۲۸۱ گھنٹے ۱۷ منٹ اور ہاں باون سکینڈ دیئے ہیں'۔

'اوہ ... نو ... تم اتنے کلکولیٹو ہو؟ میں نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہیں۔ یعنی تم ہر لمحے کا حساب رکھتے ہو'۔

'حساب نہیں، ان لمحوں میں اپنا احتساب کرتا ہوں کہ آخر میں ہوں کہاں؟ تم نے میرے لیے کیا فیصلہ کیا ہے'؟

'فیصلہ کیا...؟ وہ سب کچھ تو ہو ہی چکا ہے جو رشتے کو یقین میں بدلنے کے لیے ضروری تھا...'۔

'تو پھر ہمیں کسی اور شئے کی تلاش کیوں رہتی ہے'؟

'کس شئے کی'؟

'کہہ نہیں سکتا...'

'ٹھیک ہے۔ سوچ لو آج ساری رات یہی کام کرنا۔ مجھے جانا ہے، پاپا اِز اَلون۔ وہ بہت جلد گھبرا جاتے ہیں۔ تم نہیں سمجھو گے'۔

'اُو کے ... جاؤ ... مگر ہاں کل میں شہر سے باہر جا رہا ہوں ہفتے بھر کے لیے۔ ضروری میٹنگ ہے۔ فون پر شام میں ہی باتیں ہوں گی...'۔

'اُو کے ... ٹیک کیئر ... وِش یو اے ہیپّی جرنی ... بائی ...'۔

وہ چلی گئی۔ میں بھی سفر کی تیاری کرنے لگا۔ امی جانتی تھیں کہ بیٹے کو ہفتے بھر کے لیے باہر جانا ہے شاید اسی لیے اپنی سطح پر انھوں نے ساری تیاریاں کر دی تھیں۔ مگر ہمیشہ کی طرح یہی کہا کہ اب مجھ سے یہ سب نہیں ہونے والا۔ اکیلی ہوں۔ تمھارے علاوہ کوئی سہارا نہیں ہے۔ گھر میں بہو آنی چاہیے۔ جو تجھے پسند ہو وہی آئے۔ میری طرف سے کوئی بندش نہیں ہے۔ میں مسکرا کر ٹال دیا کرتا۔ مگر سفر کے دوران اس مسئلے پر ضرور سوچتا۔ امی ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ شادی تو کرنی ہی ہے تو پھر مزید دیر کیوں کی جائے؟

مسکان کو وہ اچھی طرح جانتی ہیں۔ انھیں پسند بھی ہے۔ وہ اسے بہو بنا کر گھر میں لانا بھی چاہیں گی۔ چلو اس سفر میں یہ طے کر ہی لیا جائے۔ مسکان سے پوچھ ہی لیتا ہوں کہ وہ شادی کے لیے تیار ہے یا نہیں۔

کافی لمبی دوری طے کرنے کے بعد شہر پہنچا۔ میٹنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ پاور پرزنٹیشن تھا۔ اپنے لیپ ٹاپ پر سب سے پہلے مسکان سے ملاقات کی اس کی جیتی جاگتی ایک بھرپور تصویر سے۔ زیر لب مسکرایا۔ لیپ ٹاپ (laptop) پر فیدر ٹچ سے ہی مسکان غائب ہوئی پھر پاور پرزنٹیشن کے مواد پر نظر ثانی کرنے لگا۔ انگلیاں بھی عجیب تھیں۔ ابھی میں اپنی ساری توجہ دفتری امور پر مرکوز کرنا چاہتا تھا مگر مسکان بیچ اسکرین پر آجاتی، اوہ نو ...! یہ کیا ہو رہا ہے؟ اگر پیشکش کے دوران بھی ایسا ہو گیا تو بہت ہُوٹنگ ہو جائے گی۔ ہیڈ آفس تک یہ بات پہنچ جائے گی۔ نو ...! ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ مسکان ...! پلیز ایسا مت کرنا۔ اِٹ اِز ناٹ فیئر ...لگتا ہے وہ مان گئی۔ وہ ہلکے سے اشارے کے بعد ہی اسکرین سے غائب ہو گئی۔

شام سات بجے تھکا ہارا اپنے گیسٹ ہاؤس پہنچا۔ موبائل آن کرتے ہی مسکان نے پکارا...

'یہ تم موبائل کب سے آف کرنے لگے'

'ارے نہیں یار ... میٹنگ میں ڈِسٹرب ہو رہا تھا۔ بس ابھی لوٹا ہوں۔ تم سے بات کرنے کے لیے ہی اسے آن کیا تھا'

'میٹنگ کیسی چل رہی ہے...'

'نُو گڈ...! صبح تم نے بہت ڈسٹرب کر دیا تھا'

'میں ...! میں کہاں سے آگئی...'

'تم گئی کہاں ہو...'

'اُو کے...! کونسنٹریشن رکھو...ورک فرسٹ'

'اور تم پر...'

'میں نے کام پر توجہ دینے کے لیے کہا ہے، کسی بھی کام پر...'

'یو آر جینیس یار'

'سو تو میں ہوں...'

'اب ہم سیریس ہو جائیں'

'کیوں، کیا ہوا؟...وہاں کوئی اور ہے کیا...؟'

'یہی پر دنیا کی ہر عورت ایک ہو جاتی ہے'

'وھاٹ ڈَز اِٹ مِین...'

’پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے اپنے پاپا سے بات کی ... اِز ہی ریڈی‘؟

’میں ان سے کیا بات کروں اور کیسے؟ ذرا سوچو، ممی کے گزر جانے کے بعد وہ ایک دم تنہا ہو گئے ہیں۔ بھائی ڈاکٹر ہو گیا۔ بیوی بھی ڈاکٹر مل گئی۔ دونوں انگلینڈ میں سیٹلڈ ہو گئے۔ بس ہر مہینے بینک اکاؤنٹ میں روپے آجاتے ہیں۔ پاپا کبھی کبھی ان سے ملنے جاتے ہیں مگر لوٹ کر اور بھی اُداس ہو جاتے ہیں۔ میں اُن سے کیسے کہوں کہ اب میں بھی آپ کو چھوڑ کر جانا چاہتی ہوں۔نو... یہ ہم سے نہیں ہو پائے گا...‘۔

دِلسن ... پلیز سنو... میری ماں بھی اکیلی ہے۔اسے بھی کوئی دیکھنے والا نہیں۔ اس نے تمام عمر ہمارے لیے بہت اسٹرگل کیا۔اب میں انھیں تکلیف دینا نہیں چاہتا۔انھیں بھی تمھاری بہت ضرورت ہے۔تم ان کی بیٹی بن کر رہو گی پلیز کچھ سوچو‘۔

’میں اپنے پاپا کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ کبھی انکار نہیں کریں گے۔ وہ صرف ہماری خوشی چاہتے ہیں۔لیکن وہ تنہا ہو جائیں گے بلکہ مر جائیں گے‘۔

’کیا پاپا ہمارے ساتھ نہیں رہ سکتے...‘؟

’وھاٹ نان سِنس یو آر ٹاکنگ؟ ہی اِز ہائیلی سینسیٹو پرسن۔ بہت خوددار ہیں اور سوشل بھی‘۔

’مسکان ...کوئی راستہ نکالو۔میرے پرابلم کو بھی سمجھو...‘

’میں اگر تمھیں ایک ایڈوائس دوں تو تم مانو گے‘

’پہلے بتاؤ بھی کہ مشورہ کیا ہے‘؟

’سننے کے بعد ہی کہہ سکوں گا‘

’اگر ہمارا رشتہ مضبوط ہے تو پھر تم میرے مشورے پر عمل کرو گے‘۔

'اچھا... چلو... کہو... بولو بھی...'

'تم کہیں اور شادی کر لو۔ تمھاری امی کو ایک گھریلو بہو چاہیے، بس اس کا خیال رکھنا'

'او ہ نو... تمھیں پتہ ہے تم کیا کہہ رہی ہو...؟'

'آئی ایم ویری کُول۔ میں بہت سوچ سمجھ کر ایسا کہہ رہی ہوں۔ ہم اپنا ٹائم ویسٹ نہ کریں۔ تمھاری ماں کا بھی تم پر حق ہے جس طرح میرے پاپا کا مجھ پر ہے پلیز تم مان جاؤ... پلیز'

'مسکان... یہ میری زندگی کا سوال ہے'

'اسی لیے تو تمھیں فیصلہ کرنے کا حق ہے'

'لیکن ہم تو بہت دور نکل چکے ہیں۔ شادی تو محض فارملٹی ہوگی'

'تم کیوں گلٹ فیل کر رہے ہو۔ تم جسے گناہ سمجھتے ہو وہ میرے وجود کا حصہ ہے۔ تم ڈار سے بچھڑ چکے ہو۔ میں کوئی دعویٰ پیش نہیں کرتی تو تم کیوں پریشان ہو'

'تو یہ تمھارا آخری فیصلہ ہے... پلیز ٹھیک سے سوچ لو...'

'ارے یار...! میں فیصلے پر یقین رکھتی ہوں سوچنے پر نہیں۔ یہ ہم دونوں کے لیے اچھا ہوگا۔ تم خیال مت کرنا... پلیز...'

اس سفر میں کئی بار مسکان سے باتیں ہوئیں۔ بہت خوشگوار ماحول میں، کبھی کبھی ہم سوگوار بھی ہوئے۔ وہ اپنے فیصلے سے بہت مطمئن تھی۔ بہت کوششوں کے بعد بھی اس نے ارادہ نہیں بدلا۔ میں سوچنے لگا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ رشتوں میں اتنی شدت اور ایمانداری کے باوجود ہم الگ ہونے کے لیے نہ صرف یہ کہ راضی ہو گئے بلکہ اس نے میری امی کی پسند کی لڑکی روبینہ سے میری شادی بھی کروا دی۔ بہت پیش پیش رہی۔ امی کی نظر میں تو وہ اور بلند ہو گئی۔

میری شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ مسکان کے پاپا نے بھی بہت دلچسپی کا مظاہرہ کیا بلکہ اسی دوران میری امی سے کہا کہ 'آپ مسکان کو بھی شادی کے لیے راضی کیجئے۔ یہ جہاں چاہے رشتہ کر سکتی ہے۔ میرے بارے میں سوچتی رہتی ہے۔ میں نے اسے کئی بار سمجھایا کہ میں بہت دولتمند ہوں، کیئر ٹیکر کی کمی نہیں ہوگی۔ مگر اسے کون سمجھائے'۔ اسی دوران مسکان نے آکر ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

'پاپا آپ پھر شروع ہو گئے۔ نئے کپل کو مبارک باد دیجئے اور گھر چلئے۔ دوا بھی لینی ہے آپ کو... پلیز...'

اس روز وہ میرا گھر بسا کر چلی گئی۔ کبھی کبھی فون بھی کرتی۔ پہلے پوچھتی کہ روبینہ کہاں ہے۔ میں کہتا رسوئی میں ہے یا امی کی خدمت کر رہی ہے یا سو رہی ہے۔

اب ہم دنیاداری پر اُتر آئے تھے...

'تم نے کون سا ٹی وی خریدا ہے...'

'وہ کوئی بگ اسکرین والا ہے۔ دیوار پر آویزاں کر دیا ہے۔ ریموٹ سے ہی تصویریں بدل بدل کر دیکھتا رہتا ہوں'

'کار بھی تم نے اچھی خریدی ہے۔ میرون کلر ہے نا... میں نے ایک دن تمھیں اور روبینہ کو اس پر سوار ہو کر کہیں جاتے ہوئے دیکھا تھا'

'ہاں بہت آرام ہے۔ اے. سی. بھی بہت اچھا ہے۔ کول... ایک دم کول... ذرا بھی سفوکیشن نہیں ہوتا'

'ویل... اوکے... بائی...'

مسکان میرے لیپ ٹاپ (laptop) سے دھیرے دھیرے غائب ہونے لگی۔ اب وہ شاید میموری میں بھی نہیں تھی۔ کسی آئی کون (Icon) میں اس کا نام ونشان باقی نہیں تھا۔ میری بیوی بہت خوش تھی۔ میں بھی اس کا پورا خیال رکھنے لگا تھا۔

مگر بظاہر سب کچھ نارمل ہونے کے بعد جب کچھ سال بیت گئے تو میرے ساتھ یہ کیا ہونے لگا۔ بھولنے کی بیماری۔ کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ گھر سے دفتر تک صرف پریشانی۔ کبھی چابی بھول گیا تو کبھی لیپ ٹاپ۔ کبھی پرس تو کبھی ...! کسی سے کیا گیا وعدہ تو روز ہی بھول جاتا ہوں۔ دیوار پر آویزاں ٹیلی ویژن ہو، اے. سی. کار یا پھر آسائش کے دوسرے سامان، کہیں دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ بہت محنت اور عرق ریزی کے باوجود کوئی بھی کام معیاری نہیں ہو پا رہا تھا۔ نیشنل یا انٹرنیشنل میٹنگوں میں پہلے میں نمائندگی کیا کرتا تھا لیکن مستقل بے اثر ہونے کی وجہ سے اب دوسرے جونیر اسٹاف کو زیادہ ترجیح دی جانے لگی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر ناراضگی۔ زیادہ تر لوگوں سے تعلقات بھی دوریوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی بے ترتیب پڑے ہوئے سامانوں سے لے کر گھر کے افراد تک میری زد میں آنے لگے تھے۔ ایک شور شرابہ۔ بے مقصد ہنگامہ۔ پڑوسیوں کے لیے میرا گھر تفریح کا مرکز بن چکا تھا۔

میرے بے ترتیب ہونے کا سلسلہ جب طویل ہونے لگا تو مجھے بہت تشویش ہوئی کہ آخر یہ کیا ہو رہا ہے۔ گھر میں سب کے ہونے کے باوجود میں اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔ اپنا کمرہ بھی الگ کر لیا ہے۔ ڈنر کے بعد اندر سے اسے مقفل کر لیتا ہوں۔ پھر دیر رات تک کتابوں میں سر کھپاتا رہتا ہوں۔ کبھی کبھی جی چاہا تو کمپیوٹر پر بیٹھ گیا۔ روبینہ میں بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ سبھوں کے سو جانے کے بعد دیر تک ٹیرس پر ٹہلتا رہتا۔ نیند بھی بہت دیر سے آتی۔ کبھی کبھی تو تمام رات یوں ہی گزر جاتی۔ نیند کی گولیوں سے مستقل افاقے کا امکان بھی ختم ہونے لگا تھا۔ ذہنی کمزوری اور لگاتار بھولنے کے عمل سے میری پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ تب خیال آیا کہ

یوگ کرنا چاہیے۔ سی. ڈی. لا کر یوگا اچاریہ کی نقل کرنے لگا۔ ہدایت کے مطابق آنکھیں بند کرنے کے بعد کہیں خلا میں کھو جانے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر اس دوران بہت ساری دشواریاں درپیش آنے لگیں۔ کھونا کہاں ہے یہی واضح نہیں ہو پا رہا تھا...... پھر بھی مصنوعی طور پر یہ سب کرتا رہا لیکن دیر تک طبیعت مائل نہ ہونے کی وجہ سے یہاں بھی جی اُچاٹ ہو گیا۔ بات بات پر ناراض ہو جانے، خود کو لگاتار کمزور ہوتا ہوا محسوس کرنے یا زندگی کی اہم ضرورتوں کو بھی بھول جانے کے عمل سے دوچار ہونے کا سلسلہ اور طویل ہوتا گیا۔ کبھی کبھی تنہائی میں جی بھر کر رو لیتا تو تھوڑا سکون ضرور ملتا بلکہ اس وقت یہ تجسس اُبھرتا کہ سب کچھ بھول گیا ہوں یا بھول جاتا ہوں تو پھر مسکان مجھے روز کیوں یاد آتی رہتی ہے۔ اسے بھی تو بھول جانا چاہیے تھا۔ اب تو بظاہر اس کا کوئی نقش باقی نہیں ہے۔ نہ موبائل میں، نہ ڈائری میں نہ لیپ ٹاپ یا کسی البم میں۔ پھر وہ کیوں مجھے جگا دیا کرتی ہے۔ میرے اندر کیوں رَچ بس گئی ہے۔ مجھے کیوں احساس دلاتی ہے کہ میرا جرم قابل معافی نہیں ہے۔ دوا لے کر بھی گہری نیند نہیں سو پاتا، اس کے آنے کی آہٹ یا کبھی کبھی چیخنے کی کوئی آواز مجھے جگا دیا کرتی ہے۔

مسکان ...! میں سچ مچ تم سے مُکتی چاہتا ہوں۔ میرے گناہوں کے ساتھ تم جینے کی کوشش مت کرو۔ پلیز مجھے جینے دو.... پلیز۔ ■

اندر بارش باہر دھوپ

یہ طے ہے کہ اب وہ لوٹ کر کبھی نہیں آئے گا۔

ممکن ہے کسی نے بدگمانی کی خاک بھی اڑائی ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اب وہ تھک سا گیا ہوگا۔ اور یہ تو ہونا ہی تھا کیونکہ اس دور میں مسیحائی کا تصور ایک سراب جیسا ہی ہے۔ وہ ایسا ہونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن کیوں اس نے خود کو تبدیل نہیں کیا۔ حالات کے بدلتے ہوئے تیور پر بھی گینی پگ ہی بن کر رہ گیا تھا۔ بڑے شہر میں تو مختلف قسم کی بیماریاں ہوا کرتی ہیں وہ بھی بیماریوں سے واقف ہونے کے باوجود خود کو بچائے رکھنے میں کبھی یقین نہیں رکھ سکا۔ ہاں یہ المیہ تو ہمیشہ اس کے ساتھ رہا کہ جلتے ہوئے مکان کی آگ بجھانے کے باوجود ہمیشہ موردِ الزام بھی ٹھہرایا جاتا رہا۔ حالانکہ میں جو کہنے جارہا ہوں وہ نیا نہیں ہے مگر آپ اگر حساس ہیں تو ایک بے نام پہلو ضرور تلاش کرسکتے ہیں۔

وہ کوئی اور نہیں ہے جو مجھ سے دور ہوگیا۔ وہ کوئی اور نہیں ہے جو اب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ میں نے ہی اسے جانے کی اجازت دی تھی۔ بلکہ اسے اتنی اذیت پہنچائی تھی کہ وہ مجبور بھی ہوا مجھ سے باہر جانے کے لئے۔ پتہ نہیں کیسے وہ میرے اندر بس گیا تھا۔ اب تو ایسا لگتا ہے کہ کاش وہ روزِ ازل سے میرے ساتھ نہیں ہوتا تو آج میرے لکھنے کے لئے بھی سونے کے قلم آتے۔ میری آسائشیں، مجھے باعزت ہونے کا شرف عطا کرتیں۔ زندگی کے اتنے لمبے ایام

کو میں کھوتو نہیں پاتا۔ اگر یہ بات باشعور افراد کی طرح میری سمجھ میں بھی آجاتی کہ یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا بس عموماً گرا کر ہی آگے نکلنے کا فن آنا چاہئے۔ باشعور بلکہ دانشور حضرات تو اس فن سے بخوبی واقف ہیں اور کتابوں میں بھی ان کے ہی قصے جا بجا ملا کرتے ہیں۔ اب کہاں کوئی جانتا ہے کہ میں نے بہت سارے سفید پوش دانشوروں کو ان کی منزلوں تک پہنچانے کے لئے ایک پُل کا کام کیا ہے۔ شاید کوئی مجھ پر یقین نہیں کرے گا۔ اور میں یقین دلانے کے لئے قصے چھیڑنا نہیں چاہتا۔

لیکن میں نے خود کو جو اذیتیں دیں اور اب اس موڑ پر پہنچ کر مکتی تو پا چکا ہوں تو یہاں سے اب جو راہیں ہموار ہو رہی ہیں، ان پر وہ سب باری باری ملیں گی۔ میں ان کے روبرو بھی رہوں گا۔ وہ مجھے اپنی بلندیوں سے نہیں پہچان پائیں گے لیکن میں ان کی پستیوں تک جا کر ان کے سامراج کو بے فیض الجھنوں میں ضرور تبدیل کر دوں گا۔

وہ جسے میں نے اپنے اندر سے نکال کر پھینک دیا ہے۔ شاید وہ برسوں گردشِ ایام میں الجھا ہوا نہیں ہوتا تو وہ حادثہ اس طرح نہیں گزرتا۔

جب اسے بہت حد تک عزیز رکھنے والا پڑوسی نائکن وقت سے پہلے مر گیا تو وہ ایک دم کانپ گیا۔ کیونکہ نائکن ایک دم بے لوث ہو کر اسے پیار کرتا تھا۔ حالانکہ نائکن کی شفقتوں میں اسے اپنے باپ کی جھلک بھی ملا کرتی تھی۔ وہ بچپن میں ہی اپنے باپ کو کھو چکا تھا پھر اسے کبھی کبھی کوئی ایسا چہرہ دکھائی دیتا کہ ایسے رشتوں پر سے وشواس جاتا بھی رہا۔ نائکن بہت غریب تھا۔ بمشکل اپنے چھوٹے سے پریوار کو ہر شام تک زندہ رکھ پاتا تھا۔ اس کی بیٹی میرین تھی تو بہت خوبصورت لیکن زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھی۔ نائکن نے اسے وقت نکال کر تھوڑی سی توجہ اس طرف بھی دینے کے لئے کہا۔ وہ میرین کو رات گئے تک خوب توجہ کے ساتھ پڑھانے میں بھی مشغول رہنے لگا۔ کالج میں داخلے کے لئے اس کی فیس اور کپڑے کا بھی انتظام کرتا رہا۔ نائکن

کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ شاید وہ اس کی بیٹی کو دل سے پسند بھی کرنے لگا ہے۔ یہی سوچ کر ایک بار اس نے دونوں کے رشتے کی بات بھی چھیڑ دی۔ اسے یہ سن کر اس وقت پھر دکھ ہوا کیونکہ اس نے کبھی اپنے اس جذبے کو میرین کے سامنے ابھرنے ہی نہیں دیا تھا۔ پھر وہ کئی دنوں تک نائیکن کے گھر نہیں گیا۔ ایک روز اچانک نائیکن کی موت کی خبر سن کر وہ نہ صرف اس کے گھر گیا، بلکہ یہ بھی طے کرلیا کہ چاہے کوئی مخالف ہی کیوں نہ ہوجائے لیکن وہ میرین کو برسرِ روزگار بھی بنائے گا اور اگر ضرورت ہوئی تو وہ اسے شریک حیات بھی بنالے گا۔ میرین کی ماں نے بھی اس جذبے کو محسوس کیا۔ اب وہ اپنے دفتر سے لوٹنے کے بعد زیادہ وقت میرین کے ساتھ ہی گزارنے لگا۔ میرین کو اس سے خاصی قربت ہوگئی۔ وہ بھی اپنے بوجھل پن کو کہیں ایسے ہی مقام پر رکھنا چاہتا تھا۔ جب میرین نے اس کی کتھا سنی تو وہ برہم ہوگئی۔ اور میرین نے اسے یقین دلایا کہ وہ تب تک میرے ساتھ ہے جب تک وہ اپنے آپ کو پہلے کی طرح ضرورت مندوں کے لئے وقف رکھے گا۔ چاہے اسے مزید ناموافق حالات کا سامنا بھی کرنا پڑے تب بھی وہ اپنے اندر کے آدمی کو مرنے نہیں دے گا۔ میرین کے اس جذبے نے اسے اور بھی زندہ رہنے کا حوصلہ عطا کیا۔ میرین نے جب اسے یہ بھی یقین دلایا کہ چاہے حالات جیسے بھی ہوں تمہارے اندر ہی بسی رہوں گی۔ جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں تم اپنے اندر کے وشواس کو مرنے نہیں دینا۔

اس طرح میرین کی باتوں نے اسے اور بھی شدت عطا کی۔ بس جنون کی کیفیت طاری ہوگئی۔ جہاں کوئی تعاون کی درخواست کرتا بس اپنا سب کچھ لٹانے کے لئے تیار ہوجاتا۔ کسی سے کوئی گلہ شکوہ نہیں کیونکہ میرین تو تھی اس کے ساتھ۔ اسی جنون نے میرین کو ایک اعلیٰ عہدے پر فائز کروادیا۔ اب تو گھر کے حالات بدل ہی گئے۔ وہ تو بہت خوش تھا۔ میرین کی ماں بس دعائیں کرتیں۔ وہ زندگی بھر جدوجہد کے بعد معمولی کلرک ہی بن سکا تھا لیکن سماج میں

اپنی خدمات کے تحت اثر و رسوخ کی وجہ سے میرین کو اونچی کرسیوں تک پہنچا دیا تھا۔ میرین تو اس کی اپنی ہی تھی۔ اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کی وجہ سے وہ اپنے نئے کوارٹر میں شفٹ کر چکی تھی۔ اسٹاف کار، پی اے اور سلامی ٹھونکنے والا گارڈ تو اس کے ساتھ ہی رہا کرتے۔ میرین کو اس بلندی تک پہنچانے کے بعد وہ اپنے اندر بہت توانائی محسوس کرنے لگا تھا۔ اور اب اسے انتظار تھا کہ شاید شادی کی پیش کش ہو۔ حالانکہ جب وہ زیرِ تعلیم تھی تب ہی اس کی ماں نے بھی یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ میرین سے شادی کر لے۔ لیکن اس نے یہ سوچ کر منع کر دیا کہ پہلے میرین ایک سماجی حیثیت کے ساتھ ابھرے اور اگر اس کے بعد بھی میرین ویسی ہی رہی تو اس سے ضرور شادی کرے گا۔ حالانکہ وہ اس کی مصروفیات سے بھی واقف تھا۔ اس بیچ وہ بھی ہیڈ کلرک ہو گیا۔ ساتھ ہی ٹرانسفر بھی ہوا۔ کسی نے کوئی مدد نہیں کی۔ اس نے بھی زیادہ زور نہیں دیا۔ نئی جگہ شہر سے بہت دور تھی۔ دو ایک بار اسٹاف کار سے میرین اس سے ملنے بھی گئی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اور پھر مہینوں بعد اسے میرین کی ماں کا ایک خط ملا۔ اسے فوراً بلایا گیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں اسے اس بار یہ امید تھی کہ میرین کی ماں شادی کے لئے ضرور کہے گی۔ اور بات بھی ایسی ہی تھی۔ جب وہ میرین کے گھر پہنچا تو خاصی چہل پہل تھی۔ کئی افسران مدعو تھے۔ باہر کئی چمچماتی کاریں لگی ہوئی تھیں۔ وہ جیسے ہی گھر پہنچا میرین چہک اٹھی۔

'اتنی دیر کیوں کر دی آنے میں۔ ویسے غلطی میری تھی۔ تمہارے لئے کار بھیج دیتی تو صبح میں ہی پہنچ جاتے۔ تم اندر کمرے میں جاؤ۔ بہت کچھ کرنا ہے۔ ماں تمہارا انتظار کر رہی ہے۔'

میرین سچ مچ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ اسے چوم لے۔ آج وہ دلہن جیسی سجی سنوری تھی۔ آس پاس مٹھائیوں اور پھلوں کی سجی ہوئی ٹوکریوں کو دیکھ کر کچھ گھبرایا کہ اندر سے ماں نے بلا لیا۔ وہ تیزی سے اندر کمرے میں گیا۔ میرین کی ماں نے اسے دیکھ کر گویا گڑگڑانا شروع کر دیا۔

'بیٹا ہم تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہماری زندگی میں اتنی خوشی بھی آسکتی ہے۔ میرین تو تمہیں اپنا بھگوان ہی مانتی ہے۔ آج ہم جو کچھ بھی ہیں بس تمہاری وجہ سے ہی ہیں۔ نہیں تو ہم بھی گھٹتے ہوئے مرجاتے۔ بہت دنوں تک میرین سے تمہاری شادی کے لئے سوچتی رہی۔ تمہیں کہا بھی تھا۔ لیکن جب تم نے کوئی جواب نہیں دیا تو ہم نے تمہیں اور پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میرین کہنے لگی کہ تم نے ہمارے لئے اتنا کچھ کیا ہے اب شادی بھی اگر زور دے کر کرنی پڑے تو یہ تم پر ظلم ہوگا۔ ایک اچھا آئی اے ایس لڑکا مل گیا تو آج صبح اس کی منگنی کرڈالی۔ تم تو خوش ہونا...... دیکھو مبارک باد دینے کے لئے بھی بڑے افسران آئے ہیں۔ بیٹا تم بھی منہ میٹھا کرلو کیونکہ اس پر سب سے زیادہ تمہارا ہی حق ہے۔'

بس یہ سب سن کر وہ ایک دم ساکت ہوگیا۔ اور دیر تک نایکن کی بیوی کو گھورتا رہا۔ اس نے تب ضرور سوچا کہ کاش نایکن کی موت کا اسے اتنا دکھ نہیں ہوتا۔

اس عظیم ترین سانحے کے بعد وہ میرے اندر بہت بے بسی کے ساتھ جیتا رہا۔ کبھی کبھی جنون کی تمام حدیں بھی پار کر جاتا۔ اب وہ مجھ میں بسا تھا لیکن میری دسترس میں نہیں تھا۔ شاید یہی سوچ کر اسے اذیت پہنچانے لگا۔ اس حد تک اسے بے بس کردیا کہ وہ مجھ سے دور ہونے لگا۔

آج میں اسے کہیں دفنا کر آیا ہوں اور یہ طے ہے کہ اب وہ لوٹ کر کبھی نہیں آئے گا۔ ■

ٹھیس

جس زمانے میں ہندوستان انگریزوں کی بربریت کا شکار ہوا تھا تب بھی مائیکل ڈیوڈ ہندوستان میں ہی رہتے تھے۔ عام انگریزوں کی طرح ان کے والدین ہندوستانیوں سے نفرت کرتے تھے۔ ان ہی نفرتوں اور ہندوستان کی تحریک آزادی کی جنگ کے درمیان مائیکل کا جنم ہوا تھا۔

اس جگہ دور تک پھیلی ہوئی آبادی میں انگریزوں کی تعداد برائے نام تھی۔ مائیکل نے اپنے عالیشان بنگلہ اور چرچ کے بیچ صرف ہندوستانیوں کو ہی دیکھا تھا۔ مائیکل جوان ہوئے اور ان کا جھکاؤ گاندھی جی کی طرف ہونے لگا تو والدین بہت فکرمند ہوئے۔ بلکہ اکثر دیر رات گھر میں ہی ان پر کورٹ مارشل ہوا کرتا لیکن یہ وہ دور تھا جب ہندوستان کو آزاد ہونا تھا اور انگریزوں کو بھارت چھوڑ دینا تھا۔

بہت سمجھانے کے باوجود جب انہوں نے اپنا رویہ نہیں بدلا تو ایک روز رات کے پچھلے پہر مائیکل ڈیوڈ کو گھر سے نکال دیا گیا۔ دسمبر کی زبردست سردیوں میں باہر آنے پر کچھ دیر تک اذیت جھیلنے کے بعد انہوں نے سوچا کہ گھر لوٹ ہی جانا چاہئے تبھی کچھ سوراجی ایک جتھے کی شکل میں نظر آئے۔ سوراجیوں کو آتے ہوئے دیکھ کر اندر سے مائیکل ڈیوڈ کی ماں نے زور زور سے اپنے بیٹے کو بلانا شروع کیا۔

'پلیز کم ان...... پلیز...... مائی سن پلیز..........'

یہ آواز سوراجیوں نے سن لی اور انہوں نے مائیکل ڈیوڈ کو دھر دبوچا۔ بھیڑ سے آوازیں ابھرنے لگیں۔

'مارو...... مارو......'

'بھارت ماتا کی جے......'

'وندے ماترم......'

'انقلاب زندہ باد......'

ماں دوڑتی ہوئی گیٹ تک آئی۔ ماں کو گھر والوں نے زبردستی اندر گھسیٹا۔ وہ کہتی رہی۔

'نو...... نو...... مائی سن از ویری انوسنٹ...... ہی از انڈین...... پلیز ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ...... پلیز۔'

ماں کی چیخ دھیرے دھیرے کم ہوئی لیکن سوراجی اور جوش میں آگئے۔

'نہیں نہیں ہمیں ان پر کوئی بھروسہ نہیں...... ہم اس انگریز کے بچے کو نہیں چھوڑ سکتے......'

تبھی اس جتھے سے ایک گمبھیر آواز ابھری۔

'یہ سچ مچ ہندوستانی ہے۔ اس کی ماں نے جو کچھ کہا وہ کسی سیاسی داؤ پیچ کا نتیجہ نہیں ہے۔ ایک ماں کے دل کی سچی آواز ہے۔ میں اس پریوار کو بھی جانتا ہوں اور اس نوجوان کو بھی۔ یہ مائیکل ڈیوڈ ہے اور گاندھی جی کا بھگت ہے۔'

اس بیان پر بھیڑ خاموش ہوگئی۔ یہ آواز تھی اس جتھے کے سب سے پرانے سوراجی

رائے نریندر سنگھ جی کی۔ مائیکل ڈیوڈ بھی انہیں بچپن سے پہچانتے تھے۔ بلکہ ان کے گھر پر سوراجیوں کی بھیڑ دیکھ کر اکثر وہ بھی ان میں شامل ہونا چاہتے تھے لیکن کبھی جانے کی ہمت نہیں ہوسکی تھی۔ کچھ دیر بعد رائے نریندر سنگھ جی نے اپنی چادر مائیکل ڈیوڈ کے بدن پر ڈال دی۔ ماں نے نیم بے ہوشی کے عالم میں یہ منظر دیکھا۔

'مائی سن از این انڈین...... مائی سن......'

رائے نریندر سنگھ جی مائیکل ڈیوڈ کو اپنے گھر لے گئے۔ انہوں نے مائیکل کو بہت سارے سوراجیوں سے ملایا۔ کچھ دنوں کے بعد مائیکل نے خواہش ظاہر کی کہ وہ بھی جتھے کے ساتھ ہر جگہ جانا چاہتے ہیں لیکن کچھ سوچ کر رائے جی نے اس کی اجازت نہیں دی انہوں نے مائیکل ڈیوڈ کو اپنی بیٹی سے ملوایا۔

'یہ ہے میری بیٹی سُدھا...... بہت ذہین ہے یہ گھر میں رہ کر بھی آندولن کے لئے بہت کچھ کر رہی ہے۔ اس نے اپنا ایجوکیشنل کیریر بریک کر دیا ہے۔ یہ تمہیں ٹریننگ دے گی اور پھر ہمیں بتائے گی کہ تم سے کون سا کام لیا جائے۔'

اس روز کے بعد سُدھا کے ساتھ مائیکل ڈیوڈ کام کرنے لگے۔ سوراجی اور خود سُدھا مائیکل کو ہر طرح سے آزماتی رہی۔ اس دوران کئی بار مائیکل کو ان کی ماں نے بلوایا۔ لیکن وہ چاہ کر بھی نہیں جاسکے۔ ہندوستان کی آزادی کے کچھ روز پہلے مائیکل ڈیوڈ کے والدین انگلستان چلے گئے۔ ماں نے اپنے تفصیلی خط میں اپنے بیٹے کو بہت دعائیں دی تھیں اور ہندوستان کی آزادی کی کامنا بھی کی تھی، ساتھ ہی انہوں نے بنگلے کی چابی بھی بھیج دی تھی۔ اس روز بھی سوراجیوں نے مائیکل ڈیوڈ سے کہا تھا کہ جاتے وقت ماں سے ضرور مل لو۔ ڈیوڈ نہ جانے کیوں بہت رونے لگے تھے۔ بعد میں سُدھا نے بھی بہت کوشش کی کہ وہ ایک بار اپنی ماں سے مل لے

لیکن مائیکل ڈیوڈ نے منع کردیا۔ ماں کے ہندوستان چھوڑنے کے بعد مائیکل کئی دنوں تک بہت اداس رہے۔ سُدھا کے لئے مائیکل ڈیوڈ ایک آئیڈیل بن چکے تھے۔

پھر ہندوستان آزاد ہوا۔ سب سے زیادہ خوشی مائیکل ڈیوڈ کو ہوئی۔ وہ زبردست ڈھنگ سے اس آزادی کو Celebrate کرنا چاہتے تھے۔ سُدھا کے ساتھ بہت دنوں بعد وہ اپنے بنگلے میں لوٹے تھے۔ جیسے ہی گھر کے اندر داخل ہوئے ماں کی قد آور تصویر ان کا خیر مقدم کررہی تھی۔ ہر کمرے میں جاکر وہ اپنی یادوں کو سمیٹ لینا چاہتے تھے۔ خوشی اور فرط جذبات سے چمکتی ہوئی مائیکل ڈیوڈ کی آنکھوں میں ایک سیلاب اُمڈ رہا تھا۔ سُدھا دیر تک انہیں دیکھتی رہی اور اچانک اس نے زور سے مائیکل ڈیوڈ کا ہاتھ تھام لیا۔ مائیکل بھی خود کو روک نہیں سکے۔

اس بنگلے میں تمام سوراجیوں نے آزادی کا جشن منایا۔

کچھ روز بعد مائیکل ڈیوڈ ایک اسکول میں انگریزی کے ٹیچر بن گئے۔ شام کے وقت جب وہ اپنے گھر لوٹتے تو اکثر ماں کا خط انہیں ملتا۔ بعد میں یہ امید بھی وقت کی گردش کی نذر ہوگئی۔ سُدھا بھی بہت کم ہی آیا کرتی تھی۔ یہ شاید اس کی مجبوری بھی تھی کہ سوراجی روپ ختم ہوگیا تھا اور ہندوستانی ناری کا روپ زیادہ ابھرنے لگا تھا۔ بڑھتی ہوئی تنہائیوں کے اندر سے ابھرتی ہوئی موسیقیت نے مائیکل کو شاعری کی طرف آمادہ کرلیا۔ بعد میں انہیں احساس ہوا کہ وہ اچھی شاعری کرسکتے ہیں۔ اب اکثر کچھ لکھ کر انہیں کمپوز کرتے، خود ریکارڈ کرنے کے بعد سنتے اور دیر تک روتے۔ تب ایسے میں اچانک انہیں سُدھا کی شادی کا کارڈ ملا تو وہ اور بھی پریشان ہو اٹھے۔ کئی دنوں تک بہت ڈسٹرب رہنے کے بعد دو ایک بار اس سے ملنے کی کوشش بھی کی لیکن جان بوجھ کر اس کے گھر تک جاکر لوٹ آتے۔ پھر رودھو کر سُدھا کی شادی میں بہت خوبصورت تحفے کے ساتھ شرکت کے لئے گئے۔ لوٹنے کے بعد جو نظم لکھی تھی اسے اپنی تنہائی میں گنگناتے رہتے تھے۔

'آئی ایم ڈسٹری بیوٹنگ دی گریف

دیٹ از ہیڈن ان آئیز..........'

شادی کے بعد سُدھا جب بھی اپنے بابو جی کے یہاں آتی تو مائیکل ڈیوڈ سے ضرور ملتی۔ مائیکل صحیح معنوں میں اتنے معصوم تھے کہ اس کے آنے پر اپنی خوشی کا اظہار بچوں کی طرح ہی کیا کرتے۔ کبھی اپنی تنہائی کا کربناک روپ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ بعد میں سُدھا بھی کم آنے لگی تھی۔ لیکن اس کی بیٹی نشا اکثر ڈیوڈ سے ملنے کے لئے آتی۔ مائیکل ڈیوڈ اسے بہت پیار دیتے تھے۔ نشا بڑی ہوکر اپنے نانا جی کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ اب وہ اسی شہر کے مقامی کالج میں پڑھ رہی تھی۔ وہ روز ڈیوڈ انکل سے ملنے لگی۔ انہیں بھی ایسا لگتا جیسے گھر میں برسوں بعد کچھ لوٹ آیا ہے۔ ریٹائرمنٹ لینے کے بعد ان کی ساری توجہ نشا کی طرف ہی تھی۔ اس کے علاوہ کوئی اس تنہا گھر میں آیا بھی نہیں کرتا تھا۔ نشا ایک طرح سے ڈیوڈ انکل کی دوست بھی بن گئی تھی۔ وہ ان کی بہت خدمت کرنے لگی۔ ڈیوڈ انکل کو بھی جینے کا ایک بہانہ مل گیا۔ اکثر نشا اپنے کالج کے دوستوں کے ساتھ بھی اس بنگلے میں آجاتی تو ڈیوڈ انکل اور بھی خوش ہو جاتے۔ ایک روز انہوں نے نشا کو رائے دی کہ

'بیٹی اتنے سارے دوستوں سے اچھا ہے کوئی ایک دوست بناؤ اور وہ بھی ایک دم پرفکٹ......'

'انکل وہ تو ہے نا......'

'کون......'

'ستیش......'

'اچھا...... ستیش!'

'تو کیا وہ تمہارا کلاس فیلو نہیں؟'

'اوہ انکل آپ بھی کیسی بات کر رہے ہیں؟ وہ ہم سے کتنا سینئر ہے۔ وہ انجینئر نگ کر چکا ہے۔ بہت اچھا آدمی ہے انکل۔ میں اسے بہت پسند کرتی ہوں۔'

'واہ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں اس سے تمہارے بارے میں بات کروں......'

'اوہ......نو......انکل......'

اس روز کے بعد نشا اور ستیش کالج کے بعد اور اکثر کالج کے دوران پورے بنگلے میں بھاگتے دوڑتے نظر آتے۔ مائیکل ڈیوڈ کو یہ سب بہت اچھا لگتا۔ وہ سوچتے کہ چلو ان کے دم سے اس ویرانے میں بہار تو ہے۔ نشا اور ستیش کو وہ کبھی کسی بھی سطح پر ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتے تھے۔

ایک روز نشا نے انکل ڈیوڈ کے ہاتھ میں تقرری کا پروانہ تھماتے ہوئے کہا۔

'دیکھیے انکل آپ انکار نہیں کریں گے۔ یہ ایک پرائیوٹ اسکول ہے۔ آپ سے بہتر کوئی انگریزی کا ٹیوٹر نہیں ہو سکتا۔ بس روز صرف چھ گھنٹے کی بات ہے۔'

'لیکن بیٹی اب میں تھک گیا ہوں یہی وجہ ہے کہ وقت سے پہلے میں نے ریٹائرمنٹ لے لیا ہے۔ نوکری میں میری کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'

'نہیں انکل آپ کو دلچسپی لینی ہوگی۔ انکل میں چاہتی ہوں کہ آپ ہمیشہ active رہیں پلیز......'

لگاتار کئی دنوں تک نشا کی ضد نے دوبارہ ڈیوڈ انکل کو نوکری کے لئے آمادہ کرلیا۔ صبح وہ خود آجاتی انہیں تیار کر کے اسکول بھیجتی اور پھر وہ خود بھی کالج چلی جاتی۔ جب ڈیوڈ انکل شام میں گھر لوٹتے تو وہ پہلے سے ہی گھر میں موجود ہوتی کہ انہوں نے ایک چابی اسے بھی دے رکھی

تھی۔ صبح و شام جب نشا ان کا خیال رکھ رہی تھی تو مائیکل ڈیوڈ کو دوبارہ اسکول میں پڑھانا اچھا لگنے لگا تھا۔ چھٹی کے روز نشا اور ستیش انہیں لے کر کہیں پکنک منانے بھی جاتے۔ اب تو سچ مچ مائیکل ڈیوڈ بہت فعال ہو گئے تھے۔ صبح میں کئی میل تک ٹہلنے کے بعد لوٹتے۔ کبھی کبھی اسکول میں بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتے بھی نظر آتے۔

اس روز مائیکل ڈیوڈ بہت خوش تھے۔ اسکول سے انہیں جو بھی روپے ملے تھے سب کے سب نشا کے لئے کپڑے اور زیورات خریدنے میں لگا دیئے تھے۔ جیسے ہی اپنے بنگلے میں داخل ہوئے کمپاؤنڈ میں ایک لال رنگ کی کار نظر آئی۔ قریب جا کر دیکھا تو خوشی سے گویا جھوم اٹھے۔ یہ کار سُدھا کی تھی۔

نشا نے بتایا کہ اس کی ممی آج آنے والی ہے۔ جب سُدھا نے کار خریدی تھی تو مائیکل کو دکھانے کے لئے خود ڈرائیو کر کے آئی تھی۔ اس روز پہلی بار مائیکل ڈیوڈ باضابطہ طور پر اس کے شوہر سے ملے تھے۔ تب نشا میٹرک کا امتحان دے رہی تھی۔ سرپرائز کے لئے مائیکل ڈیوڈ نے چور دروازے کو چپکے سے اپنی چابی سے کھولا۔ اہتمام سے اسے بند کیا پھر آہستہ آہستہ اندر داخل ہوئے۔ سُدھا اپنے پتی اور ہونے والے داماد ستیش کے ساتھ سرگوشیاں کر رہی تھی۔ مائیکل ڈیوڈ نے چھپ کر سننے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ابھی اچانک چیخ کر سرپرائز دینے کے لئے سبھوں کو اپنی طرف مخاطب کرنا ہی چاہ رہے تھے کہ سُدھا نے نشا کو آواز دیتے ہوئے کہا۔

’......اوہ جلدی کرو نشا۔ اب چائے بنانے میں اتنی دیر! ہمیں جلدی جانا بھی ہے۔ تمہارا انکل اگر آ گیا تو سر درد ہو جائے گا ہمارے لئے۔ پھر ہمیں بیکار ہی رکنا پڑے گا...... وہ گاندھی کی کتھا لے کر بیٹھ جائے گا۔ اب یہ سب بہت بور لگتا ہے۔ پلیز جلدی کرو نشا......‘

مائیکل ڈیوڈ کو پہلے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ پھر اپنے کانوں کو دھیرے سے

چھوا۔ آہستہ آہستہ بمشکل وہ دیوار کی اوٹ میں چھپنے میں کامیاب ہوئے۔ تب انہیں ایسا لگا کہ دیواریں چاروں طرف سے جکڑ رہی ہیں۔ دھیرے دھیرے آنسوؤں میں اپنی یادوں کو دھونے کی ناکام کوششیں کیں۔ چند لمحوں میں ہی صدیاں بیت گئیں مائیکل ڈیوڈ کو اس کا احساس بھی نہیں ہوا۔

جب وہ بنگلہ ایک دم خاموش ہوگیا۔ سبھی چہکنے والی آوازیں اپنے گھونسلوں کی طرف چلی گئیں اور ہر طرف اندھیرے بکھر گئے تو بہت بوجھل قدموں کے ساتھ مائیکل ڈیوڈ اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگے۔ اندھیرے میں ہی بستر کو ٹٹولتے ہوئے اس پر دراز ہوگئے۔ کھلی آنکھوں کے سامنے سوراجی سُدھا کا چہرہ ہر زاویے سے نظر آنے لگا۔ وہ سوچنے لگے کہ آخر کیا کچھ ہوگیا ہے آج۔ ایسا ہونا کیا ممکن ہے؟ اتنا کچھ بھی بدل سکتا ہے؟ کل تک ایسا سوچنا بھی گناہ تھا۔ اس دور میں سوراجی سُدھا یا اس کے پریوار کے ساتھ رہنے والا کوئی بھی شخص اپنی سچی آستھا کے بکھرنے کی کلپنا بھی نہیں کرسکتا تھا۔

بہت رات بیت جانے کے بعد مائیکل ڈیوڈ اپنی پرسنل لائبریری میں گئے۔ انہوں نے وہ سب کتابیں ایک جگہ جمع کیں جن میں گاندھی جی کے فلسفے تھے۔ دیر تک مدھم روشنی میں وہ ان کتابوں کو دیکھتے رہے۔ جب بہت زیادہ پریشان ہوئے تو گاندھی جی کے ہی ایک پسندیدہ بھجن کو جس میں ان کی عقیدت تھی گنگنانے کی کوشش کرنے لگے۔

ویشنو جن تو تے نے رے کہیے

پیر پرائی جانے جے

پھر وہ کئی دنوں تک زبردست ادھیڑ بن میں رہے۔ اس قدر انہیں کبھی کسی نے مصروف رہتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا۔ صبح گھر سے نکلتے تو رات گئے گھر لوٹتے۔ کوئی بھی پوچھتا

تو بس یونہی مسکرا کر رہ جاتے۔ اسکول چھوڑ دیا تھا۔ نشا میں اب اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ کوئی وجہ بھی دریافت کر سکے۔ جبکہ مائیکل نے کسی سے کچھ نہیں کہا تھا۔

مہینوں کی مصروفیات کے بعد ایک رات بہت سکون کے ساتھ انہوں نے اپنی کرسی کو ٹیبل کے پاس لایا۔ قلم اور کاغذ لے کر کچھ لکھنے کے لئے بیٹھے۔ پھر انہوں نے ٹیبل پر اپنا نیا پاسپورٹ ہوائی جہاز کا ایک ٹکٹ اور گھر کے کاغذات رکھے۔ پاسپورٹ اور ہوائی جہاز کے ٹکٹ کو گاندھی جی کے فلسفے پر اپنی سب سے پسندیدہ کتاب کے اندر رکھا۔ مکان کے کاغذات پر اپنی ایک ہتھیلی رکھ کر سُدھا کو خط لکھنے لگے۔

سُدھا......!

میں نے بہت چاہا لیکن اپنی آستھا کو نہیں توڑ سکا۔ ایک ہندوستان کو ہم سب نے مل کر آزاد کروایا تھا۔ دوسرا ہندوستان تھا ہمارا بنگلہ۔ اس پر ہمارے والدین کا کل تک قبضہ تھا لیکن میں نے اسے بھی اپنی جنم بھومی کے نام پر آزاد کروالیا صرف تمہارے لئے...... اب تم اس گھر میں آسکتی ہو کہ کبھی میرے آنے کا خوف بھی نہیں ہوگا۔

مائیکل ڈیوڈ

مائیکل نے خط کو کئی بار پڑھا۔ پھر سُدھا کی ایک پرانی تصویر کو مکان کے کاغذات کے اندر رکھا۔ ساتھ ہی خط کو بھی اس میں موڑ کر رکھتے ہوئے کمرے کی روشنی گُل کر دی۔ ■

وہ لڑکی

وہ لڑکی ہے تو بہت خوبصورت۔ خاموش ہے تو شاید گمبھیر بھی ہوگی۔ وہ اس طرح چپ ہے کہ کوئی چاہ کر بھی گفتگو نہیں کرسکتا۔ شاید اس کی آنکھوں میں کچھ خمار سا ہے۔ وہ سونا چاہتی ہے لیکن ایک بھیڑ جگی ہو تو وہ بہت کوشش کے باوجود سو نہیں سکتی۔ اور پھر یہ چھوٹا سا پلیٹ فارم، جہاں ٹرین آنے سے پہلے بھیڑ کچھ اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ اکثر مسافر اپنی ہی تلاش میں سرگرداں ہو جاتا ہے۔ نہیں جانتا کہ وہ کون ہے۔ کہاں سے آئی ہے اور کہاں جانا ہے۔ چونکہ سب کچھ بہت قرینے کے ساتھ اس کے وجود سے وابستہ ہے اس لئے پلیٹ فارم پر دور دور تک اس تنہا لڑکی کی خوشبو بکھری ہے۔ ایک گروپ اس کے پاس جاتا ہے اور پھر لوٹ آتا ہے۔ وہ چپ چاپ ایک بنچ پر بیٹھی ہے۔ لیکن یہ عجیب معاملہ ہے کہ کوئی اس کے پاس جا کر بیٹھنے کی کوشش نہیں کر رہا ہے۔ اس نے کسی کو روکا بھی نہیں ہے اور شاید ایسے میں کوئی رک بھی نہیں سکتا۔ ابھی پلیٹ فارم پر اتنی بھیڑ نہیں ہے کہ اس لڑکی کی شناخت گم ہو جائے۔ ممکن ہے بھیڑ ہو بھی جائے تب بھی وہ تنہا سی خوبصورت سی لڑکی لوگوں کی نگاہ کا مرکز بنی رہے گی۔

ٹرین آج پھر تین گھنٹے لیٹ ہے۔ لڑکی کو اس کی خبر ہے مگر وہ اونگھنے کی کوشش بھی نہیں کر رہی ہے۔ یعنی ٹرین رات کے ایک بجے تک آئے گی۔ لڑکی چاہتی تو ویٹنگ روم میں بھی جا سکتی تھی، لیکن اس اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں تو ہر طرف گانجے اور سگریٹ کی بدبو ہے۔ شاید

کوئی نارمل شخص بھی وہاں نہیں جائے گا۔لڑکی نے اپنے لئے مناسب جگہ کا انتخاب کیا ہے۔شاید وہ اسٹوڈنٹ اور جرنلسٹ بھی ہوسکتی ہے۔اس کے چہرے اور آنکھوں میں جو اعتماد ہے اس سے یہ طے ہے کہ وہ بھاگی ہوئی لڑکی نہیں ہوسکتی۔اگر ایسا ہوتا تو ٹرین کے لیٹ ہوجانے کے بعد بہت بے چین ہوجاتی۔کسی ایک جگہ گھنٹوں نہیں بیٹھتی۔وہ ٹرین کے رینگنے سے کچھ پہلے کہیں سے اچانک نمودار ہوتی اور چپکے سے کسی بوگی میں کسی انجان عورت کے پاس جاکر بیٹھ جاتی۔ صرف بدلتے ہوئے مناظر کو دیکھتی ۔ جان بوجھ کر آنے والے مسافروں سے بے خبر ہوتی۔ بھاگی ہوئی لڑکیوں میں اور بھی بہت ساری خوبیاں ہوا کرتی ہیں۔ان میں سے کوئی بھی خوبی اس کے پاس نہیں ہے۔ایک پُر اعتماد لڑکی گھر سے بھاگتی نہیں ہے، بلکہ اپنے گھر کو ہی اپنی سوچ میں تبدیل کرلیتی ہے۔

ممکن ہے یہ ویسی ہی لڑکی ہو۔میں اس کے بارے میں کیوں اس حد تک سوچ رہا ہوں۔شاید اس لئے کہ وہ تنہا ہے، بہت خوبصورت ہے اور میرے پاس بھی ڈھیر سارا وقت ہے۔میں اگر چاہ لوں تو اس کے پاس جاکر بیٹھ سکتا ہوں۔ایسا میں اس لئے نہیں کررہا ہوں کہ کہیں وہ مشکوک نہ ہوجائے۔ حالانکہ بھیڑ بڑھے گی تو پھر کوئی نئی خوشبو بھی اپنی توجہ مبذول کروانے میں کامیاب ہوسکتی ہے۔میں نے پاس میں گھومتے ہوئے ایک ہاکر سے رسالہ خرید لیا اور پھر لڑکی سے ٹھیک پیچھے والی بنچ پر بیٹھ گیا۔اب میں اس کے گھنے خوبصورت بالوں یا کبھی کبھی اس کی خوبصورت انگلیوں کو بہت دیر تک دیکھ سکتا ہوں۔اس نے اپنی بانہیں پھیلادی ہیں۔بنچ کے نشیب پر اس کی انگلیاں اب دھیرے دھیرے ڈول رہی ہیں۔میں چاہوں تو ان انگلیوں کو بے خیالی میں چھوسکتا ہوں، لیکن ایسا کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ میں رسالے کے اوراق کو بہت بے دلی سے الٹنے کی کوشش کررہا ہوں۔

کہیں، یہ وہ لڑکی تو نہیں، جس کی ایک رپورٹ شائع ہونے پر اسٹیشن ماسٹر کا ٹرانسفر

کر دیا گیا تھا۔ اس نے پلیٹ فارم اور خصوصی طور پر ویٹنگ روم کی بدعنوانیوں پر رپورٹ لکھی تھی، جس کے شائع ہونے پر خاصا ہنگامہ ہوا تھا۔ لیکن وہ اس طرح تنہا کیوں بیٹھی رہے گی۔ وہ تو اسٹیشن کے گوشے گوشے میں پھر کچھ تلاش کرتی نظر آتی۔ حالانکہ اس رپورٹ کے بعد بھلے ہی اسٹیشن ماسٹر کا ٹرانسفر کر دیا گیا ہو لیکن یہاں تو کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے۔ نہیں یہ وہ لڑکی نہیں ہوسکتی۔ اچانک بھیڑ بڑھنے لگی ہے۔ شاید ٹرین آنے والی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ہجوم سا امڈ آیا ہے۔ رات کے ایک بج چکے ہیں۔ اعلان بھی کیا جارہا ہے۔ کئی افراد اس لڑکی کے پاس جا کر بیٹھ چکے ہیں۔ یہ سب مسافر ہیں۔ ان کے بیٹھنے پر بھی اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا ہے۔ کاش میں بھی بیٹھ جاتا لیکن اب تو سیٹ بھی خالی نہیں ہے۔ میں نے سوچ لیا کہ جس بوگی میں سوار ہوگی، میں بھی اسی بوگی میں جا کر، بلکہ اس کے پاس جا کر بیٹھ جاؤں گا۔ ٹرین کے آتے ہی لڑکی کھڑی ہوجاتی ہے۔ اب مجھے بھی یہ احساس ہونے لگا کہ ایسا تو نہیں کہ اس کا کوئی خاص آنے والا ہے اور وہ ریسیو کرنے آئی ہو۔ ہاں یہ عین ممکن ہے میری طرح اسے بھی صرف چار اسٹیشن بعد ہی اترنا ہو۔ محض دو گھنٹے کا سفر۔ ممکن تو کچھ اور بھی ہوسکتا ہے۔ لڑکی تجسس کے ساتھ آتے جاتے مسافروں کو دیکھنے لگتی ہے۔ شاید اسے کسی کی تلاش ہے۔ ضرور کوئی آنے والا ہے۔ ٹرین سے مسافر اترتے رہے اور پھر اس میں نئے مسافر سوار ہوتے رہے۔ لیکن لڑکی کے پاس محض ایک تجسس ہی تھا اور کچھ بھی نہیں۔ میں نے سوچ لیا۔ بہت کچھ سوچ لیا ہے اس کے بارے میں۔ لیکن اگر وہ آنے والے کسی مسافر کو خوش آمدید کہہ کر لپٹ جائے گی تو پھر میرا خیال بھی کہاں لے جائے گا؟

ٹرین اب رینگنا چاہتی ہے۔ کوئی نہیں آیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید کوئی آئے گا۔ جب ٹرین رینگنے لگی تو میں بھی اس میں سوار ہونے کے لئے بڑھا، لیکن یہ کیا کہ وہ معصوم سی، خوبصورت سی اور پُر اعتماد سی لگنے والی لڑکی اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ روتے روتے

پھر بنچ پر بیٹھ گئی۔ میں اسے دیکھنے لگا اور ٹرین زور زور سے رینگنے لگی بلکہ تیز رفتار بھی ہوگئی۔ میں چاہ کر بھی اس میں سوار نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ اب بھی سسک رہی تھی۔ دھیرے دھیرے پلیٹ فارم ایک دم خالی ہوگیا۔ پھر وہ چھوٹا سا پلیٹ فارم اچانک خاموش بھی ہوگیا۔ بس اب اس لڑکی کی سسکیاں تھیں اور دور تنہا کھڑا ہوا میں۔

وہ لڑکی کوئی جرنلسٹ نہیں ہوسکتی۔

وہ کوئی بھاگی ہوئی لڑکی بھی نہیں ہے۔

یقیناً وہ بے حد جذباتی اور شاید اپنے سماج میں علاحدہ ایک تنہا لڑکی ہے، جسے یقیناً کسی کا انتظار ہے۔ اور آج بھی وہ نہیں آیا۔ وہ لوٹ کر بھی کہاں جائے گی؟ رات اور تنہائی تو کسی بھی شخص کو خوفزدہ کرسکتی ہے۔ اب تو صبح پانچ بجے سے پہلے کوئی ٹرین نہیں آئے گی۔ کم از کم مجھے تو اسی پلیٹ فارم پر اور چار گھنٹے رہنا ہوگا۔ کیا اس چار گھنٹے میں، میں اس لڑکی کو جان سکوں گا۔ ممکن ہے کچھ دیر بعد وہ لوٹ جائے۔ میں پھر پاس والے بنچ پر جاکر بیٹھ جاتا ہوں۔ لڑکی بھی چپ ہوجاتی ہے۔ پھر کچھ دیر بعد وہ سو بھی جاتی ہے۔

دراصل وہ سوئی ہوئی لڑکی بہت سہمی ہوئی بھی ہے۔ جو حادثہ گزرا ہے اسے بھلا کون بھول سکتا ہے۔ وہ ایک متوسط طبقے کی بے حد خوصورت لڑکی۔ اپنی تین بہنوں میں سب سے چھوٹی۔ معاشی بدحالی نے اس کے پریوار کو توڑ دیا تھا۔ وہ سنتی آرہی تھی کہ ہم کئی یگوں سے تنگدستی کے شکار ہیں۔ شاید اسی لئے اس نے خود کو جدوجہد میں جھونکنے کا فیصلہ کیا۔ ساتھ ہی کہیں نہ کہیں یہ خواب بھی تھا اس کے پاس کہ ڈھیر ساری دولت آجائے۔ مگر یہ سب کیسے ممکن تھا۔ ابھی تو وہ محض ایم اے کی طالبہ تھی۔ کسی کمزور لمحے میں اس کی ملاقات ممبئی کے ایک بہت بڑے تاجر سے ہوئی تھی۔ تاجر اس چھوٹے سے شہر میں اپنا کاروبار پھیلانا چاہتا تھا۔ کئی دنوں تک وہ چھوٹے شہر کے بڑے ہوٹل میں رہا۔ کئی نوجوانوں کا انٹرویو لیا اور اسی دوران وہ لڑکی بھی اس

کے پاس گئی۔ لڑکی پسند کر لی گئی۔ مختلف مواقع فراہم کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ لڑکی نوجوان سے قریب سے قریب تر ہوگی۔ نوجوان نے اسے خواب دکھائے، اسے کسی نہ کسی بہانے سے قیمتی تحائف اور روپے بھی دیئے اور پھر شادی کا وعدہ بھی کیا۔ لڑکی نے بھی پورے طور پر خود کو نوجوان کے حوالے کر دیا اور پھر وہ اس کی عارضی پی اے بن کر شہر در شہر اس کے ساتھ گھومتی رہی، حالانکہ ایسا کرنے پر لڑکی کے گھر کا ماحول پورے طور پر مکدر ہو گیا۔ لڑکی نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ بدنامیاں گھر سے گلیوں، گلیوں سے سڑکوں، سارے شہر اور قرب و جوار میں پھیل گئی۔ لڑکی کے باپ نے سماجی سطح پر اسے بالکل الگ کر دیا اور اپنی بقیہ لڑکیوں کی شادی کے لئے تگ و دو شروع کر دی۔ بدنامیوں کی وجہ سے باپ کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔

نوجوان تاجر لڑکی کو پورے طور پر استعمال کرتا رہا۔ مگر بالآخر پتہ چلا کہ نوجوان شادی شدہ ہونے کے ساتھ ایک بدنام ترین شخص ہے۔ اب دونوں کے رشتے میں تناؤ بھر گیا۔ لڑکی لوٹ کر اپنے گھر تو نہیں جا سکتی تھی اور نوجوان بھی کسی قیمت پر شریک حیات کا درجہ نہیں دے سکتا تھا۔ ایک روز دونوں فرسٹ کلاس کے کوپے میں سفر کر رہے تھے۔ لڑکی بہت زیادہ مضمحل تھی دونوں دیر تک آپس میں جھگڑتے رہے۔ لڑکی کبھی کبھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی تو نوجوان اسے کسی طرح پانی پلانے میں کامیاب بھی ہو جاتا۔ اور اس دوران جب دو غنڈے اچانک رات کے پچھلے پہر کسی اسٹیشن پر اس ٹرین میں سوار ہو جاتے ہیں اور اس ٹرین میں سوار لڑکی کے گلے میں بیش قیمتی سونے کا ہار نظر آتا ہے تو وہ اس کے پاس جا کر ہار کو نوچتے ہیں۔ لڑکی اب تنہا ہے۔ نوجوان تاجر اسے چھوڑ کر جا چکا ہے ہار نوچنے کے بعد غنڈوں کو جب نہ چیخ نہ کوئی پکار ملی تو انہیں یہ شک، ہوا کہ لڑکی شاید مر چکی ہے۔ اس کے آس پاس بھی کوئی نہیں تھا۔ تاجر کوپے کا دروازہ کھول کر بھاگ چکا تھا۔ غنڈے ہار لے کر آنے والے اسٹیشن کا انتظار کرنے کے لئے گیٹ پر چلے جاتے ہیں۔ قیمتی ہار سے ہونے والی آمدنی کے تصور کے بیچ نہ جانے کیسے بار بار لڑکی کی لاش بھی سامنے آجاتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو محض دیکھتے رہتے ہیں اور پھر نہ جانے اسٹیشن

کے آنے پر انہیں کون سی طاقت لاش کی طرف لے جاتی ہے۔ وہ اسے چھوکر دیکھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ شاید اس میں کچھ زندگی باقی ہے۔ دونوں کسی طرح لڑکی کو پلیٹ فارم پر لاکر پاس کے بنچ پر لٹا دیتے ہیں۔ علاقے میں لوگ ان غنڈوں کے گروپ سے خائف رہتے تھے۔ اس لئے کسی کو کچھ بھی بولنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ اطمینان سے کچھ لوگوں کی مدد سے لڑکی کو ہسپتال پہنچادیتے ہیں۔ ڈاکٹر ان کا علاج نہیں کرنا چاہتا، مگر جب دونوں ایک ساتھ اپنا پرچے دیتے ہیں تو ڈاکٹر فوراً علاج کے لئے تیار ہوجاتا ہے۔ لڑکی کسی طرح بچالی جاتی ہے، مگر وہ نہ جانے کیوں بالکل ہی بدحواس ہوجاتی ہے۔ غنڈے لڑکی کا ہار واپس تو نہیں کرتے مگر جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دم تنہا ہے تو وہ جم کر اس کا استعمال ضرور کرتے ہیں۔ اس چھوٹے سے پلیٹ فارم کے ویٹنگ روم میں غنڈے لڑکی کو چھوڑ جاتے ہیں اور لڑکی بھی مستقل پلیٹ فارم اور ویٹنگ روم کے درمیان جھولتی رہتی ہے۔ غنڈے چوبیس گھنٹے میں ایک بار اس کے پاس ضرور آتے ہیں۔ کسی کی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ اس پر کوئی کاروائی کرے۔ لڑکی بھلے ہی ذہنی طور پر نفسیاتی مرض کا شکار ہوچکی تھی لیکن نہ جانے کیوں اب تک اس نوجوان کو بھول نہیں سکی تھی جس سے والہانہ طور پر جڑی تھی جبکہ نوجوان تاجر نے اسے زہر دے کر مار ڈالنے کی کوشش کی تھی اور وہ رات کی گہری خاموشی میں اسے چھوڑ کر کسی اسٹیشن پر اتر گیا تھا۔

میں اونگھ رہا تھا کہ اچانک دو غنڈے اس کے پاس آتے ہیں۔ بہت اطمینان سے وہ لڑکی کو ویٹنگ روم میں لے جاتے ہیں۔ لڑکی چیختی نہیں ہے۔ کوئی مدد بھی نہیں چاہتی۔ میں خوفزدہ ہوجاتا ہوں کہ اس چھوٹے سے ویران سے اسٹیشن پر اگر میرے ساتھ کوئی حادثہ ہوگیا تو پھر میں کچھ نہیں کرپاؤں گا۔ یہی سوچ کر میں دھیرے دھیرے وہاں سے سرکنے لگا۔ ویٹنگ روم سے بدبو آرہی تھی۔ لڑکی پوری طرح غنڈوں کی گرفت میں تھی۔ میں نے سوچا کیوں نہ پولیس کو اس کی خبر دی جائے۔ یہ سوچ کر اسٹیشن سے باہر نکلنے لگا تو میں نے ریلوے کے ہی ایک اسٹاف سے پوچھ لیا۔

'آخر یہ کیا ہو رہا ہے آپ کے اسٹیشن پر؟'

'کیوں، کیا ہو رہا ہے؟' اس نے مجھ سے ہی سوال کر دیا۔

میں نے چاہا کہ اسے سب کچھ صاف صاف کہہ دوں۔ پھر یہ بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ میں نے تو صرف چند گھنٹے ہی اس اسٹیشن پر گزارے اور مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ یہاں کیا کچھ ہوتا ہے۔ جو رات کی ڈیوٹی کر رہا ہوا سے تو شاید مجھ سے بہت زیادہ جانکاری ہو گی۔ ممکن ہے وہ بھی ان میں سے ہی ایک ہو۔ اگر میں نے اپنی زبان کھولی تو شاید میں ہی موردالزام ٹھہرایا جاؤں۔ اس نے مجھ سے پھر سختی سے پوچھا کہ:

'تم نے بتایا نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ کوئی جرنلسٹ ہو کیا......؟'

میں نے نفی میں سر ہلایا اور پھر یہ کہتے ہوئے بڑھ گیا' 'نہیں کچھ بھی نہیں۔'

پاس کے ایک ہوٹل میں دیر تک بیٹھا رہا، کبھی چائے پی تو کبھی سگریٹ۔ پھر سوچا کہ پولس اسٹیشن جاؤں مگر چاہ کر بھی ایسا نہیں کر سکا۔ لگ بھگ دو گھنٹے کے بعد دونوں غنڈے اسٹیشن سے باہر نکلے، لیکن لڑکی ان کے ساتھ نہیں تھی۔ پاس والی دکان سے سگریٹ لینے کے بعد دونوں لڑکھڑاتے ہوئے باہر نکلے اور پھر ایک پولس والے سے ٹکرائے، اسے سگریٹ پلائی اور ہاتھ ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ میں نے سوچا اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

دیر تک چائے کی دکان کے بنچ پر بیٹھا ہوا سوچتا رہا کہ سچ مچ اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ جو ایک بھیڑ ابھی سے کچھ گھنٹے پہلے اس پلیٹ فارم پر آئی تھی، جس نے تنہا لڑکی کو دیکھا بھی تھا، بہتوں نے اسے محسوس بھی کیا تھا۔ لیکن سب محض سفر کے لئے ایک تفریح کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ میں بھی ان لوگوں میں ہی شامل ہوں۔ میں نے تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ چاہتا تو کچھ کر سکتا تھا۔ لیکن اپنے وجود کو خطرے میں ڈال کر اپنے مستقبل کو تاریک ہوتا ہوا محسوس

کرنے کے بعد اس حادثے سے خود کو الگ رکھا۔ جب نہیں جانتا تھا کہ وہ خوبصورت سی پیاری سی لڑکی نہ جانے کس کا انتظار کر رہی تھی تب تک میں بھی اس سے نہ جانے کیوں بہت بے نام رشتے کے ساتھ وابستہ ہو گیا تھا۔ اسے چھونے کی بات تو دور میں اس کے پاس بھی محض اس لئے نہیں بیٹھ پا رہا تھا کہ کہیں وہ برا نہ مان لے، وہ مجھے اوروں جیسا تصور نہ کرنے لگے۔ لیکن جب میری آنکھوں نے ہی اسے تار تار ہوتے دیکھا تو ایک ہی پل میں وہ انام رشتہ ٹوٹ کر بکھر گیا۔

پتہ نہیں کیوں، مجھ پر مسیحا بننے کا بھوت سوار ہے۔ چالیس کا ہو چکا ہوں۔ اماں کوشش کر کے تھک گئیں مگر میں نے شادی نہیں کی، جب کہ ایک معمولی میڈیکل ریپرزنٹیٹو ہو کر بھی نہ صرف اپنی بہنوں بلکہ چھوٹے بھائیوں کو والد کے گزر جانے کے بعد اعلیٰ تعلیم دلوائی اور سبھوں کی شادی بھی کروا دی۔ مگر اس دوران میں نے رشتوں کے جو بدلتے ہوئے تیور دیکھے ہیں، نہ جانے کیوں اب مجھے مسیحا بننے میں کوفت سی ہونے لگی ہے۔ حالانکہ یہ سچ ہے کہ تنہائیاں مجھے بہت پریشان کرتی ہیں۔ اس لڑکی میں ایسا کچھ کیا تھا جس نے پہلی بار مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ مگر میں یہ سب کیوں سوچ رہا ہوں۔ مجھے کم از کم اس لڑکی کو جا کر دیکھنا چاہئے کہ اب وہ کس حال میں ہے۔

میں دھیرے دھیرے وہاں سے اٹھتا ہوں۔ بہت بوجھل قدموں کے ساتھ پلیٹ فارم کی سیڑھیاں طے کرتا ہوں۔ سیڑھیاں مجھے روکتی ہیں۔ سیڑھیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ پھر بھی میں اپنے بوجھل پن پر حاوی ہو رہا ہوں۔ شاید صبح ہونے میں چند ساعتیں باقی ہیں۔ ٹرین بھی ٹھیک وقت پر آنے والی ہے۔ پھر بھی پلیٹ فارم پر سب کچھ خاموش ہے۔ وہ لڑکی ٹھیک اسی جگہ پر پھر آ کر بیٹھ گئی ہے۔ اب میں تیز قدموں سے اس کی طرف بڑھنے لگتا ہوں۔ اس کی حقیقت سے واقف ہونے اور حادثے کے گزر جانے کے بعد اب مجھ میں اعتماد آ گیا تھا۔ میں اس لڑکی کے پاس پہنچتا ہوں، بلکہ اس کے پاس جا کر بیٹھ جاتا ہوں وہ مجھے بغور دیکھتی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

'وہ دونوں کون تھے؟'

(کوئی جواب نہیں)

'تم نے کوئی مدد کیوں نہیں مانگی؟'

(کوئی جواب نہیں)

'تمہیں کس کا انتظار ہے؟'

(کوئی جواب نہیں)

پھر میں نے جھلا کر کہا۔'تمہیں کچھ پتہ ہے؟ آج کی رات میں نے کیسے گزاری؟ میں نے کیا کیا سوچ لیا تھا تمہارے بارے میں اور تم......؟'

لڑکی مجھے اس طرح دیکھنے لگی جیسے میرا اس سے کوئی پرانا رشتہ ہو۔ وہ چاہتی تھی کہ میں ایسے ہی بولتا رہوں۔ پھر اس نے کہہ ڈالا۔

'چپ کیوں ہو گئے بولو۔ یا پھر تم بھی ویٹنگ روم میں......'

میں نے گویا چیخ کر کہا۔'تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ میں ان غنڈوں میں نہیں کہ تمہیں اپنی دسترس میں لے لوں۔ تمہیں نوچ کر اپنی ہوس مٹاؤں......'

لڑکی رونے لگی۔ میں نروس ہو گیا۔ پھر وہ مجھے بہ مشکل بولی کہ وہ جو مجھے اس پلیٹ فارم پر چھوڑ کر گیا ہے، وہ بھی تم جیسا ہی آئیڈیل تھا۔ شاید ایسا ہی بزدل بھی۔ ان غنڈوں کے پاس تو اپنا کردار ہے جسے ہم سب جانتے ہیں۔ وہ کبھی آئیڈیل نہیں بنا۔ اس نے جو کچھ کیا وہ سب کے سامنے ہے۔'

وہ دیر تک بولتی رہی۔ میں بھی خاموشی سے سنتا رہا۔ سوچتا رہا۔ ایسے میں میری ٹرین آ جاتی ہے۔ بھیڑ بہت کم ہے۔ لڑکی کہتی ہے کہ......

'جاؤ، نہیں تو پھر تمہاری ٹرین چلی جائے گی اور تم مجھے الزام دیتے رہوگے۔'

میں اٹھتا ہوں لڑکی بھی میرے ساتھ اٹھتی ہے۔ میں اس سے پوچھتا ہوں۔' اب وہ نہیں آئے گا تو پھر انتظار کیوں......'

'میں جانتی ہوں کہ وہ نہیں آئے گا۔ لیکن اسے اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ یہاں سے گزرنا ہے کبھی۔ اسے یہ تو پتہ چلے کہ میں جن غنڈوں کی دسترس میں ہوں وہ میرے محافظ ہیں۔'

'کیا ایسا کبھی ہو پائے گا......'

'ہاں ایک وشواس تو ہے۔ بس یہی بہت ہے میرے لئے، اور اگر ایسا نہیں بھی ہوا تو کیا فرق پڑے گا؟'

پھر ٹرین سیٹی دے کر رینگنے لگی۔ وہ مجھے دھکے دے کر جانے کے لئے کہتی ہے۔ کہتی ہی جاتی ہے اور میں اس ٹرین کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھتا رہتا ہوں۔ اس کا چیخنا اب بھی کم نہیں ہوا تھا، لیکن میرے ارادے کا مستحکم ہونا بھی بتدریج جاری تھا۔

ٹرین جانے کے بعد اس کا شور، اس کا غصہ اچانک تھم جاتا ہے وہ دھیرے دھیرے بنچ پر بیٹھتے ہوئے بس اتنا کہتی ہے۔

'تمہیں چلے جانا چاہئے تھا۔'

میں خاموش تھا۔ اس کی انگلیوں نے مجھے زور سے تھام رکھا تھا۔ ■

افسانچے

تین چہروں والا میں

۱۵ر ستمبر ۱۹۴۷

نچلے طبقے کا میں، اور میری ضرورتیں۔ ہاتھ میں مہینے بھر کی تنخواہ کُل تیس روپے۔ بیوی کی جلی کٹی باتیں۔ بچوں میں احساس کمتری اور ماں باپ کی ناراضگی۔

۱۵ر ستمبر ۱۹۵۷

متوسط طبقے کا میں اور میری ضرورتیں۔ میرا ایمان۔ میرے سپنے۔ ہاتھ میں مہینے بھر کی تنخواہ کُل ایک سو پچاس روپے۔ بیوی کی فرمائشیں۔ بیٹوں کی فکر۔ ماں کی بیماری اور میرا سگریٹ۔

۱۵ر ستمبر ۱۹۷۷

اونچے طبقے کا میں۔ میری شان۔ عمارت کی بڑھتی اونچائی۔ انکم ٹیکس والوں کا خوف۔ کالے دھن کی حفاظت۔ ہاتھ میں مہینے بھر کی کل آمدنی دس لاکھ روپے۔ خریدے ہوئے داماد۔ ماں باپ کے نام اسکول، ہوٹل، کالج۔ بیوی کی رنگ برنگی خواہشوں کی تکمیل اور مجھے تیسرے ہارٹ اٹیک کا انتظار۔

سیلاب

سیلاب تیزی سے بڑھتا جارہا تھا۔ رات کی گہری تاریکی میں لوگوں کی آوازیں ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ پھر کوئی چیخ بھی ابھرتی۔ آوازوں کا ٹکراؤ بڑھتا رہا لیکن کوئی مسئلے کا حل تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ گاؤں پورے طور پر ڈوب گیا۔ تباہی کا یہ منظر دوسرے دیہاتوں کی طرف بھی پھیل گیا۔ اندھیرے اور خوفناک ہوتے رہے۔ پھر کسی طرح صبح ہوئی۔

دوسرے کنارے پر کئی لاشیں ملیں۔ لوگ لاشوں کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے اور اپنی اپنی سطح پر انہیں نوچنے کی کوشش کررہے تھے۔ اسی بیچ ایک آدمی کو گہنے سے لدی ہوئی ادھیڑ عمر کی کسی عورت کی لاش نظر آئی۔ موجیں تیز تھیں، اس لئے لاش جلد ہی اس کے پاس پہنچ گئی۔ عورت کے گہنوں کو اس نے نوچنا شروع کیا۔ تب ہی بے ہوشی کی حالت میں وہ کراہ اٹھی۔ آدمی پل بھر کے لئے پیچھے ہٹ گیا اور پھر عورت کو موجوں کے حوالے کرتے ہوئے زیر لب بڑبڑایا۔ 'زندہ ہے سالی......'

پھوڑا

میرے جسم پر ایک پھوڑا ہے جو رات گئے درد کے ساگر میں دور گہرائیوں تک جانے کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔ میری آنکھیں کتنے سمندروں کو دھند کی سرحد میں داخل ہونے کے لئے بےچین کر دیتی ہیں۔ جب مجھے وہ حادثہ...... ہاں وہی کالے ناگ اور انسانی خون والا، یاد آنے لگتا ہے تو اندھیرے بھی سہم جاتے ہیں۔ کالے ناگ ساری رات ڈستے رہے تھے۔ نہ جانے کتنی جانیں گئی تھیں پھر کسی بھیانک رات سے ہزار جبڑوں والا جانور ابھرا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے کتنی زندگیاں تباہ ہوگئی تھیں۔ جس حصے میں لوگ زندہ رہ گئے تھے انہوں نے کہا تھا کہ ناگ دیوتا پر ٹھیک سے چڑھاوا نہیں ہونے کی وجہ سے اوپر والے نے ایسی تباہی مچائی۔ پتہ نہیں کس طرح میں بچ نکلا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ پھوڑا رات گئے بالکل زندہ ہو جاتا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ ایسا دنیا میں بسے اور دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی ہوا کرتا ہوگا کہ ہم کسی نہ کسی سطح پر ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں، جبکہ سبھی بارود کے ڈھیر پر کھڑے ہوکر کسی زوردار دھماکے کا انتظار کر رہے ہیں۔

اچانک دونوں خاموش ہو گئے۔

بات دھرم پر رُک گئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ زندگی بھر ایک ساتھ گزارنے کا فیصلہ بھی کر چکے تھے۔ جب ان دونوں کا جسم گرم ہوتا تو جذبات بہت کچھ بولتے۔ نشہ ٹوٹتے ہی اپنی اپنی تصویر کسی شفاف آئینے میں نظر آ جاتی۔ اس مسئلے کے ابھرنے کے بعد بھی دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں سمائے جسم و جان کا حصہ بنتے رہے۔

مگر مسئلہ یوں ہی رہا۔

وہ کہتا۔ میرے لئے تم اپنا دھرم نہیں بدل سکتی؟

وہ کہتی۔ تم بھی تو ایسا کر سکتے ہو!

دونوں کہتے۔ یا پھر ہم کوئی تیسرا راستہ طے کر لیں۔

وہ کہتا۔ لیکن

وہ بھی کہتی۔ لیکن!

پھر چند مہینوں تک بدن کی جمالیات سے گزرنے کے بعد دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

برسوں بعد ملے۔

دونوں اپنا اپنا گھر بسا چکے تھے۔ کافی خوش بھی نظر آئے، مطمئن تھے کہ انہوں نے اپنا دھرم بچا لیا تھا۔

عبادت

اس روز ماحول میں اذان کی آواز گونج رہی تھی۔ جاڑے کی سرد رات میں بھی نمازیوں کے قدم مسجد کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ اکبرامام بھی ان نمازیوں میں شامل تھے۔ محلے والے ان کی بڑی عزت کیا کرتے تھے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ نوجوانی سے ہی وہ بلاناغہ عبادت کے لئے مسجد آیا کرتے تھے۔ ہمیشہ کی طرح اس سرد رات میں بھی انہیں مسجد کی طرف سب سے پہلے جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا اور نماز ختم ہونے کے بعد جب سارے نمازی لوٹ چکے تو اخیر میں بہت دیر تک عبادت کرنے کے بعد اکبرامام گھر کی طرف لوٹ رہے تھے رات اور بھی سرد ہو چکی تھی۔

راستے میں انہوں نے ایک بڑے نالے میں ایک انتہائی ضعیف آدمی کو کراہتے ہوئے دیکھا۔ بوڑھے آدمی نے اکبرامام سے مدد کی اپیل کی۔ آنکھ سے کم نظر آنے کی وجہ سے وہ نالے میں گر پڑا تھا۔ اس کی لاٹھی پاس ہی میں کہیں کھوگئی تھی۔ بوڑھا مدد کے لئے انہیں پکارتا رہا۔ اکبر امام نے کئی بار اس کی بھرائی ہوئی آواز سنی۔ لیکن لاحول پڑھتے ہوئے اپنے گھر کی طرف ہی بڑھتے رہے۔ بوڑھا انہیں پکارتا رہا۔ وہ ان سنی کرتے رہے۔ پھر کچھ دیر بعد گھر پہنچ کر تیزی سے دروازہ بند کیا۔

دوسری صبح سردی سے اکڑی ہوئی اس غریب بوڑھے کی لاش نالے میں ملی۔

پتہ نہیں کیوں؟ آج بھی اس بوڑھے کی بھرائی ہوئی آواز اکبرامام کے دروازے سے ٹکرا کر لوٹ جاتی ہے۔ ■

کوئی آواز

گہری خاموشی میں دیوار پر آویزاں گھڑی کی ٹِک ٹِک کو سنتے ہوئے کبھی کبھی نیند نہیں آتی ہے اور ایسے میں اگر رات کے پچھلے پہر لگا تار ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگے تو خوف کا احساس ہونے لگتا ہے۔ آج میرے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے۔ میں سونے سے پہلے ٹیلی فون کو اس کمرے میں رکھ دیتا ہوں جہاں عموماً میرے علاوہ کسی کو جانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ میری خاموشیاں اس کمرے میں بولتی ہیں۔ جہاں تک بیڈ روم کا سوال ہے تو اس کمرے میں میری بیوی ساتھ ہوا کرتی ہے۔ عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد وہ مجھے ڈائننگ ٹیبل پر سجاتی ہے اور پھر متعینہ وقت پر ٹیلی ویژن کے پروگراموں کو دیکھتی رہتی ہے۔ اس دوران آنے والے ٹیلی فون یا دستک دینے والے کسی بھی شخص کا سیدھے مجھ سے ہی مکالمہ ہوا کرتا ہے۔ بچے جوان ہو چکے ہیں۔ دارین انجینئر ہے اور امریکہ میں بس گیا ہے۔ میری پیاری بیٹی صائمہ اپنے شوہر کے ساتھ سعودی عرب میں ہے۔ بہت خوش ہیں دونوں بچے۔ میرا کاروبار بھی پھل پھول رہا ہے۔ بچے میرے لئے بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں، لیکن میں انہیں منع کر دیتا ہوں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میری بیوی عشاء کی نماز کے بعد فارغ ہو جاتی ہے۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ بڑے شہر کے نوکروں پر بھروسہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ انہیں شام سے پہلے ہی فری کر دیتی ہے۔ دراصل میری تنہائی کا سفر بھی یہیں سے شروع ہو جاتا ہے۔ بہرکیف!

رات کے پچھلے پہر لگا تار فون کی گھنٹی سے میں کچھ خوفزدہ ہو جاتا ہوں۔ موبائل کے

دور میں بھی میں صرف لینڈ لائن پر ہی اکتفا کرنے میں عافیت محسوس کرتا ہوں۔ بچے ملک کے باہر رہتے ہیں اور ان کا بھی وقت طے ہے۔ انہوں نے ہندوستانی وقت کا بھی ہمیشہ خیال رکھا ہے۔ مگر انہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ پتہ نہیں کیا ہوا ہے؟ سب خیریت تو ہے؟ کہیں صائمہ کی پرانی بیماری! نہیں نہیں، میں بھی کیا سوچنے لگا ہوں۔ اچھا جانے دو بہت ضروری کال ہوگا تو پھر آئے گا ٹیلی فون۔ مگر یہ گھنٹی بھی خوب ہے طے شدہ وقت سے زیادہ بج رہی ہے۔ اب تک تو بند ہو جانا چاہئے تھا اسے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا ہے۔ گھنٹی لگاتار بجتی جاتی ہے۔ اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ آواز مدھم نہیں ہے۔ کمرہ بند ہونے کے باوجود ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے میرے بیڈ روم سے ہی آواز آرہی ہے۔ میں اندھیرے میں دھیرے دھیرے کمرے سے نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بیوی آسانی سے نہیں جگ سکے گی یہ میں بھی جانتا ہوں مگر پڑوسیوں کی نیند تو خراب ہو ہی سکتی ہے۔ گھنٹی بند نہیں ہو رہی ہے۔ میں اپنے بیڈ روم کا دروازہ کھولتا ہوں، اور پھر دوسرے کمرے کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگتا ہوں۔ ٹیلی فون والے کمرے کا دروازہ کھولتا ہوں۔ گھنٹی اور تیز ہوگئی ہے۔ روشن دان سے کوئی ہلکی روشنی ابھر رہی ہے۔ میں کمرے میں روشنی پھیلانا نہیں چاہتا کہ ٹیلی فون پر گفتگو کے لئے روشنی کی کیا ضرورت؟ نہ جانے کیوں آج میں، بہت سہما ہوا ہوں۔ مجھے لگ رہا ہے یہ کوئی نارمل فون نہیں ہوسکتا۔ رات کے پچھلے پہر اتنا اضطراب کیوں؟ پھر اپنے اندر ہمت سمیٹ کر ٹیلی فون اٹھاتا ہوں۔ گھنٹی چپ ہو جاتی ہے۔ مگر کوئی بے چین شخص میرے دھیرے سے 'ہیلو' کہنے پر ایک ہی سانس میں بولنے لگتا ہے۔

'عجیب آدمی ہیں آپ؟ میں مستقل آپ کو ٹیلی فون کرر ہا ہوں۔ دیر تک رنگ ہونے کے باوجو آپ خاموش ہیں؟ کیوں اتنے خوفزدہ تھے؟ میں کوئی چنگی مانگنے والا نہیں ہوں۔ نہ ہی آپ کو کوئی دھمکی دینے جارہا ہوں۔ کوئی بری خبر بھی نہیں پہنچانے والا ہوں۔ آپ اتنے بزدل کیوں ہیں۔ بس رات کے پچھلے پہر آپ کو جگا دیا تو بے چین ہوگئے؟ شیم ...... شیم ......!

'بھائی ایسی بات نہیں ہے!'

'اگر ایسی بات نہیں ہے تو ٹیلی فون کیوں نہیں اٹھا رہے تھے؟ یہ مان کیوں نہیں لیتے کہ آپ خود سے خوفزدہ ہیں۔'

'میں پھر کہہ رہا ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں کبھی خود سے خوفزدہ نہیں ہوتا۔ مگر یہ ٹیلی فون کرنے کا کوئی وقت ہے اور سب سے عجیب بات تو یہ ہے کہ آپ نے اب تک اپنا نام نہیں بتایا۔ مقصد نہیں بتایا۔ میرا خیال ہے کہ میں آپ کو جانتا تک نہیں اور یہ طے ہے کہ آپ بھی مجھے نہیں جانتے۔'

'سنئے سنئے دھیان سے سنئے آپ کا ٹیلی فون نمبر ہے 2665948۔ آپ کا نام ہے جعفر امام۔ آپ کی بیٹی صائمہ اور بیٹا دارین ہے۔ صائمہ اپنے شوہر کے ساتھ سعودی عرب میں ہے۔ دارین امریکہ میں مقیم ہے۔ صائمہ سے آپ بہت پیار کرتے ہیں اور پیار محض اس لئے نہیں کہ وہ آپ کی بیٹی ہے۔ بلکہ اس کے عالمِ وجود میں آتے ہی آپ کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا کنٹریکٹ ملا تھا۔ اسی کنٹریکٹ نے آپ کو آسمان کی بلندیاں عطا کر دیں۔ آپ ہر روز صائمہ کا چہرہ دیکھ کر ہی دن کا کام شروع کرتے تھے۔ اسے دمے کا مرض ہے۔ آپ نے بہت علاج کروایا لیکن کوئی خاص افاقہ نہیں ہوا۔ دارین پر آپ کو ناز ہے۔ اس نے آپ کا نام روشن کیا ہے۔ ہمیشہ آپ کی مرضی کے مطابق ہی کام کیا ہے یہاں تک کہ اس نے آپ کی پسند کو ہی اہمیت دیتے ہوئے اپنی برسوں کی دوستی کو قربان کر دیا۔ دارین کی بیوی ایک اچھی بہو ضرور ہے لیکن وہ کبھی اس کی محبوبہ نہیں بن پاتی۔ دراصل آپ رشتوں کا بھی کاروبار کرتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ مجھے نہیں جانتے، مگر یہ دعویٰ کیوں کئے بیٹھے ہیں کہ کوئی آپ کو نہیں جانتا؟'

'مگر......مگر...... میری بات بھی آپ سن لیں۔ یہ سچ ہے کہ میں آپ کو نہیں جانتا۔ کبھی آپ سے میری گفتگو نہیں ہوئی ہے۔ مجھے سخت تعجب ہے کہ آپ میرے بارے میں اتنا کچھ جانتے ہیں۔ عجیب شخص ہیں آپ۔ تعارف تو دیجئے۔ میں اپنے سبھی دوستوں کو یاد کرنے کی

کوشش کروں گا کہ شاید ان میں سے، ہی ہوں آپ۔'

'تو ٹھیک ہے۔ آپ اپنے سبھی دوستوں کو یاد کیجئے۔ آپ ذہن پر زور دیجئے کہ میں کون ہوسکتا ہوں۔ آپ کے بارے میں اتنا کچھ جاننے والا میں کون ہوں؟ مگر آپ یہ جان لیجئے کہ میں اور بھی بہت کچھ جانتا ہوں آپ کے بارے میں، آپ کی بیوی کے بارے میں۔ آپ کی محبوبہ روبی کے بارے میں......'

'شٹ اپ! شٹ اپ! اب تو حد ہوگئی۔ آپ کہیں مجھے بلیک میل تو نہیں کرنا چاہتے؟ اگر ایسی بات ہے تو......'

'اوہ۔ سنو! میں تم جیسے آدمی کو بلیک میل کروں گا؟ تمہاری اوقات ہی کیا ہے؟ دھیان سے سنو......! تمہیں چوبیس گھنٹے کا وقت دیتا ہوں۔ مجھے پہچاننے کی کوشش کرو۔'

'ہیلو......ہیلو......!'

فون ڈسکنکٹ ہوجاتا ہے۔ سخت سردی کے باوجود میرا جسم پسینے سے شرابور ہوچکا ہے۔ میں نے سگریٹ تلاش کی۔ کب وہ لب تک پہنچی مجھے اندازہ نہیں ہوا۔ میں نے کمرے کی ساری کھڑکیاں کھول دیں۔ چاند کی کرنیں اور سڑک کے لیمپ پوسٹ کی مدھم روشنیاں میرے کمرے میں آگئیں۔ دریچے سے باہر سنسان سڑکوں پر کہیں کچھ نہیں تھا بس چاروں طرف خاموشیاں تیر رہی تھیں اور میں ان خاموشیوں میں ڈوبتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ ذہن کے نہاں خانوں سے جھانکنے والے ماضی کے بے شمار چہروں کو دیکھنے اور انہیں پہچاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ کوئی چہرہ واضح طور پر دھند سے ابھرتا دکھائی نہیں دیتا۔ گفتگو کا سلسلہ پھر بھی ختم نہیں ہوتا۔ آخر کون ہے وہ شخص؟ میری زندگی کی کتاب میں کہاں ہے اس کا نام؟ وہ مجھے اس حد تک کیسے جانتا ہے۔ اور اگر جانتا بھی ہے تو کریدنے کی کوشش کیوں کر رہا ہے؟ اچھا......اچھا......وہ فہیم ہوسکتا ہے!

میرے بچپن کا دوست میرے دکھ سکھ کا ساتھی۔ ارے ہاں...... میں بھی کیا آدمی ہوں۔ فہیم کو ہی بھول گیا؟ مگر اسے اتنی رات گئے فون کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو لگ بھگ ہر ہفتے مجھ سے ملتا ہے۔ ایک طرح سے ہماری فیملی ہی اس کے جینے کا مقصد ہے۔ اس نے بھی دولت اُگاہی تو بہت کرلی ہے مگر کوئی بھوگنے والا نہیں ہے۔ بس بیوی کیا گزر گئی اس کا قدرت سے وشواس ہی اٹھ گیا۔ ہم سبھوں نے بہت ضد کی کہ دوبارہ شادی کرلے لیکن ہمیشہ خوبصورتی سے ٹالتا رہا اور بعد میں تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس نے جینے کا بہانہ تلاش کرلیا ہے۔ اب اسے کسی ایسے سُکھ کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔ چونکہ یہ اس کا نجی معاملہ ہے اس لئے زیادہ ٹوکنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ مگر......! ٹیلی فون پر وہ آواز تو فہیم کی نہیں ہوسکتی! اتنی خوبصورت آواز۔ اتنا بارعب لب ولہجہ۔ نپے تلے جملے۔ فہیم تو ہکلاتا ہے اور آواز پر تو گمان ہوتا ہے کہ کوئی خاتون اس کے اندر سے بول رہی ہے۔ نہیں وہ ٹیلی فون فہیم کا تو نہیں ہوسکتا۔ مگر میرے بارے میں کوئی اتنا جانتا بھی نہیں ہے۔ میں تو ہمیشہ سفر میں رہا ہوں۔ ادھر کچھ دنوں سے ایک دفتر کھول کر اس شہر میں مقیم ہوں۔ ہوسکتا ہے روبی نے فون کروایا ہو۔ روبی پھر میری زندگی میں آنے کی کوشش کررہی ہو۔ اس شخص نے میری محبوبہ روبی کا ذکر کیا تھا۔ اسے روبی کے بارے میں جانکاری کیسے ملی؟ میرے اور روبی کے علاوہ تو شاید اور کوئی اس رشتے کے بارے میں نہیں جانتا۔ میں نے شادی کے بعد اس کے سارے خطوط بھی جلادیئے ہیں۔ کوئی ثبوت باقی نہیں رہنے دیا ہے۔ اور پھر اتنے برسوں بعد کوئی کیوں مجھے پریشان کرے گا؟ میں اپنی شادی کے بعد کبھی روبی سے ملا ہی نہیں۔ اس نے بھی ایسی کوشش نہیں کی بلکہ اپنے گھر سے الگ ہوکر اس نے نوکری کرلی۔ وہ مجھے کیوں پریشان کرے گی؟ اور پھر اسے کمی کس بات کی ہوگی۔ روبی ایسا کر رہی نہیں سکتی۔ اگر وہ اس مزاج کی ہوتی تو میری شادی کے وقت ہی ہنگامہ کرسکتی تھی اب تو اس پر کوئی یقین بھی نہیں کرے گا۔ مگر وہ ہے کون......؟ میں دیر تک سوچتا رہتا ہوں اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پانے کی وجہ سے مجھے نیند بھی آجاتی ہے مگر پھر چونک جاتا ہوں اور صبح کے اُگنے تک سو نہیں پاتا۔

اس روز دن بھر دفتر میں بھی بے چین رہا۔ شام ہونے کا انتظار ہی حاوی رہا۔ پھر دل

بہلانے کے لئے کسی ہوٹل میں چلا گیا دیر تک کونے میں بیٹھ کر شغل کرتا رہا۔ جب رات زیادہ ہوگئی اور بار بند ہونے لگا تو مجبوراً مجھے سڑک پر آنا پڑا۔ سڑکیں تنہا ہونے لگی تھیں۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ دھیرے دھیرے بلکہ بہت محتاط ہوکر گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا میں اپنے گھر پہنچا۔ بیوی انتظار کررہی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی سمجھ گئی۔ کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ نماز ادا کرنے والی عورت کے سامنے میں خود کو مجرم سمجھ رہا تھا اور یہی سوچ کر اپنے نجی کمرے میں یہ کہتے ہوئے چلا گیا کہ 'کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔'

بیوی پہلے بھی یہ سب جھیل چکی تھی اس لئے وہ بیڈروم میں جاکر سوگئی۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ میں اندھیرے میں بیٹھ کر دیر تک سگریٹ پیتا رہا۔ بار بار ٹیلی فون پر نگاہ ٹھہر جاتی ہے۔ پھر ذہن پر زور دیتا ہوں۔ نہ جانے کیوں روبی بار بار سامنے آکر کھڑی ہوجاتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میری جدوجہد کے ساتھ لگاتار وہ بھی ہم سفر رہی تھی۔ یہ بھی طے ہے کہ اس نے میرے لئے ڈھیر ساری قربانیاں دیں یہاں تک کہ میرے کیریر کو خوبصورت بنانے کے لئے اپنی محبت کو بھی قربان کردیا۔ میں بھی مصلحتاً خاموش رہا۔ مگر کچھ ایسے رشتے ہیں، جو وقت کی دھند میں ڈوبتے نہیں ہیں۔ روبی سے میرا رشتہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ میں روح کی گہرائیوں سے ابھر کر برسوں جسم و جاں کے رشتے سے بھی شدت کے ساتھ وابستہ رہا اور ایسے میں روبی کو بھلایا جانا بھی مشکل تھا۔ مگر اب عمر کی جس دہلیز پر آکر کھڑا ہوچکا ہوں اس جگہ ماضی کے ایسے قصے کو زندہ کرنے کا کیا حاصل؟ روبی ایسا نہیں کرسکتی؟ اسے اگر ضرورت ہوگی تو مجھے سیدھے کہہ دے گی۔ میں تو آج اس کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ وہ ایک بار صرف ایک بار خود مجھ سے آکر مل لے یا ٹیلی فون پر بجائے دوسروں کے ذریعے مجھے دھمکانے کے، سیدھے اپنا مدعا بیان کرے۔ عجیب المیہ ہے یہ بھی کہ کوئی اس حد تک پستی کا شکار ہوسکتا ہے؟ اگر اب ٹیلی فون آیا تو میں صاف صاف کہہ دوں گا کہ سیدھے روبی کو بات کرنے کو

کہو۔ میں نیچ کے آدمی سے بات نہیں کروں گا۔ دیر تک اسی ادھیڑ بن میں رہا اور نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔

آج کمرے کی کھڑکیاں پہلے سے ہی کھلی تھیں۔ رات کے پچھلے پہر پھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی ہے۔ میں چونک کر اٹھ جاتا ہوں۔ گھنٹی بج رہی ہے۔ باہر سے آنے والی روشنی بھی تیز ہو گئی ہے۔ میں اپنے آپ کو تیار کرنے کے بعد ٹیلی فون اٹھا لیتا ہوں۔ پھر وہی آواز۔ اس کے ہیلو کے جواب میں، میں بھی جب ہیلو کہتا ہوں تو وہ اپنے مخصوص بارعب لہجے میں پھر بولنے لگتا ہے۔

'تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تمہیں بلیک میل کرنے کے لئے فون کر رہا ہوں۔ شرم آنی چاہئے تمہیں۔ اور روبی کے بارے میں تمہارا خیال اتنا گھٹیا اور فرسودہ ہو گیا ہے۔ یہ تم کس دنیا میں جی رہے ہو؟ تمہارے مستقبل کو تابناک بنانے والی روبی اگر چاہتی تو تمہیں شادی سے روک سکتی تھی۔ اس کے لکھے ہوئے خطوط تو تم نے جلا دئے لیکن تمہارے لکھے ہوئے خطوں اور گزارے ہوئے لمحوں کے ساتھ وہ جی رہی ہے۔ دراصل سفر تو وہ کر رہی ہے۔ کبھی اس شہر میں تو کبھی اس شہر میں۔ وہ تمہارے کاروباری وجود کو مردہ قرار دے چکی ہے۔ مگر اپنے اکلوتے بیٹے کو اس نے تمہارا نام دیا ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ روبی کا شوہر مر چکا ہے۔ اس نے اپنے بچے کو جوان کیا اور اب وہ اس کی شادی کر رہی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ تم ایک کمزور مرد کے مقابلے ایک تنہا عورت کی تپسیا کی جیتی جاگتی تصویر کو محسوس کرو۔ وہ چاہتی ہے کہ......'

اور پھر دیر تک اس آواز کو سنتا رہتا ہوں۔ وہ شخص بولتا رہتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ میں اسے دھیان سے سُن رہا ہوں۔ سچ مچ اس کی آواز میں کھو جاتا ہوں۔

ٹیلیفون پر جس آواز کو ابتک نہیں پہچان پا رہا تھا دراصل وہ تو میری اپنی ہی آواز تھی۔ ■

حربہ

فری اسٹائل کُشتی ہونے کے بعد بھیڑ چھٹنے لگی تھی۔ دونوں استاد ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ ہارنے والے کے آگے پیچھے زیادہ لوگ جمع ہو رہے تھے۔ اصولاً یہ بھیڑ مُنّو پہلوان کے پاس جمع ہونی چاہئے تھی۔

گلی کے چند اوباش چھوکرے ہلڑ مچاتے ہوئے اپنے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ جھروکے سے جھانکتی لڑکیوں کو ایک نوجوان اس طرح دیکھ رہا تھا کہ دونوں پاؤں ٹخنوں تک نالے میں چلا گیا وہ کھسیانی ہنسی لئے اوپر کی طرف نظر ڈالتا ہوا تیزی سے میوا ساؤ کی گلی میں داخل ہو گیا۔

مُنّو نے راستے میں کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ اس لئے کہ آج تیسری بار بھی شیر خاں کو پچھاڑنے پر لوگوں نے اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا تھا جیسا کہ پچھلی بار کر چکے تھے۔

شیر خاں اس محلے کے سب سے زیادہ مالدار شخص ہیں۔ وہ کشتی تفریحاً لڑا کرتے تھے چونکہ کبھی کسی سے ہار نہیں مانی اس لئے آج تیسری بار مُنّو کو پچھاڑنے کی انتھک کوشش کی تھی۔ یہ تقدیر کی ستم ظریفی کہئے کہ بیچارے پھر ناکام رہے۔

مُنّو کا تعلق ایک غریب خاندان سے ہے۔ اس کا باپ بھی اپنے زمانے کا مشہور پہلوان

تھا اس نے شہر سے باہر جا کر بھی کئی سورماؤں کو پچھاڑا تھا۔

مُنّو گھر بنانے والا مزدور تھا۔ دن بھر کی محنت و مشقت کے بعد جب شام کو وہ اپنے گھر لوٹا کرتا ہے تو اس کی بیوی اسے گرم گرم روٹی اور چائے کا ناشتہ کراتی ہے۔ وہ اپنی بیوی سے بہت خوش رہتا ہے، اس لئے وہ اس کے ساتھ ہر اچھے برے وقت میں بھرپور تعاون دیتی ہے۔ ان دنوں بچوں کے ساتھ مائیکے گئی ہوئی ہے اس لئے گھر کا سارا کام مُنّو کو ہی کرنا پڑتا ہے۔

دوستوں نے راہ میں اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ اپنے گھر پہنچا اور سونے کی غرض سے بستر پر بھوکا ہی لیٹ گیا۔ پھر سوچنے لگا کہ آج شیر خاں کو تیسری بار ہرایا ہے۔ انہوں نے جب بھی مجھے چیلنج کیا میں نے بلا جھجک قبول کرلیا۔ کشتی لڑتے وقت شیر خاں کے آدمی مجھے پست کرنے کی کوشش میں لگے رہے کہیں سے یہ آواز نہیں آئی —— شاباش مُنّو پہلوان —— جے ہو مُنّو پہلوان کی —— جب کہ سبھوں کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ جیتوں گا میں ہی —— کب تک ہوگا؟ یہ سچ ہے کہ شیر خاں بہت بڑے آدمی ہیں۔ وہ اگر چاہیں تو مجھ جیسے سینکڑوں مزدوروں کو بٹھا کر کھلا سکتے ہیں شہر میں ان کے جتنے بھی مکان ہیں تقریباً سبھی کو میں نے بنایا ہے۔ جب میں گاندھی میدان کے قریب والا مکان بنا رہا تھا تو یہ خیال اکثر آتا تھا کہ خدا کسی کو اتنی دولت کیوں دے دیتا ہے؟ جب میں ان کے یہاں کام کرتا تھا تو ان کا حکم ماننا میرا فرض تھا لیکن کشتی کے اکھاڑے میں بھی وہ مجھ سے یہی چاہتے ہیں۔ یہاں میں کیسے زیر ہو جاؤں؟

صبح مُنّو نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تو اس کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ بمشکل وہ بستر سے اٹھا اور ہاتھ منہ دھو کر پچھلے دن کی بچی ہوئی روٹی کا ناشتہ کیا اور کام پر نکل گیا۔

شیر خاں صبح ٹھیک دس بجے سو کر اٹھے۔ ان کے بھی سارے جسم میں سخت درد تھا۔ انہوں نے نوکروں کو آواز دی۔ چار نوکر ان کے سرہانے کھڑے ہو گئے۔ نوکروں سے شیر خاں نے

سارے جسم میں تیل مالش کروانا شروع کر دیا۔ وہ کچھ بولنا چاہ رہے تھے کہ ان کی والدہ نے کمرے میں قدم رکھا۔ نوکر اپنا کام کرتے رہے۔ شیر خاں نظر نیچی کیے لیٹے رہے۔ کچھ دیر بعد ماں نے ہی کہا۔

'بیٹا! رات کُشتی تھی نا؟'

'ہاں، اماں۔'

'ارے میں نے تجھ سے کتنی بار کہا کہ لوگوں سے نہ لڑا کر، آخر اس کا اور تیرا کیا جوڑ ہے، وہ ٹھہرا گنوار مزدور اور تو......'

'تم ٹھیک کہتی ہو اماں، ایسے لوگوں سے مجھے نہیں لڑنا چاہئے۔ اس کم بخت کا جسم اتنا زیادہ مہکتا ہے کہ سانس روکے بنا چین ہی نہیں ملتا۔ اکھاڑے میں وہ جوں جوں میرے قریب آتا گیا، بدبو سے میں پیچھے ہٹتا گیا۔'

'ہاں مالکن، حضور بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اگر کوئی دس منٹ اس کے پاس کھڑا ہو جائے تو اس آدمی پر بے ہوشی چھانے لگے۔' منشی جی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

'جب مُنو حضور کو پچھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا تو حضور کا ہاتھ اپنی ناک پر تھا، میں سمجھ گیا کہ حضور، کسی بھی طرح اس کے بدن کی بدبو کو برداشت نہیں کر پا رہے ہیں اور جب یہ بے ہوش جیسے ہو گئے تو مجھے مکمل طور پر یقین ہو گیا کہ حضور اس کے بدن کی بدبو برداشت نہیں کر پائے اور......'

'تم نے بالکل ٹھیک سمجھا۔ کچھ لوگ تو یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ اس نے مجھے بری طرح پچھاڑا ہے اس لئے میں بے ہوش ہو گیا ہوں۔'

'نہیں حضور، بالکل ایسی بات نہ تھی۔ آپ کو جب ہوش آیا تو آپ نے یہ اندازہ لگا ہی

لیا ہوگا کہ کوئی بھی مُنّو کی جیت پر خوش نہ تھا۔ کسی نے بھی مُنّو کی جیت پر جے جے کار نہیں کی، سبھوں کو پورا یقین تھا کہ جیت آپ ہی کی ہوگی۔'

'دیکھ بیٹا! اب تو ایسے نیچ لوگوں سے نہیں لڑے گا، بھلا ایسے گندے آدمی سے تجھے لڑنے کی کیا ضرورت تھی؟'

'وہ بہت سورما بنتا ہے اماں، اسی لئے میں نے اس سے لڑنا چاہا تھا۔ پچھلی بار اس نے مجھے پچھاڑا کیا کہ سر اٹھا کر چلنے لگا تھا۔ ویسے ایک بار اسے ہرانا بہت ضروری تھا......'

'بالکل نہیں، میں تمہیں کبھی یہ رائے نہیں دوں گی۔'

'نہیں مالکن، ایسا نہ کہیے۔ یہ چھوٹی ذات کے لوگ بڑے کمینے ہوتے ہیں۔ وہ شہر بھر میں ڈینگ مارے گا کہ میں شیر خاں کو تیسر بار بھی پچھاڑ دیا ہے۔'

شیر خاں کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ نوکر تیل مالش میں لگے تھے۔ منشی جی بڑبڑائے جا رہے تھے۔ اماں کبھی منشی جی، کبھی شیر خاں اور کبھی ان چار مسٹنڈوں کو بھی دیکھ لیا کرتی تھیں۔ جو بظاہر منشی جی کی باتوں میں دلچسپی لے رہے تھے۔

شام جب منشی جی اور شیر خاں امینیہ ہوٹل سے لوٹے تو شیر خاں نے اپنے کمرے کو بند کرتے ہوئے بہت اداس لہجے میں کہا۔

'منشی جی! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ مُنّو کا باپ ہمارے یہاں نوکری کرتا تھا، مُنّو نے بھی بہت دنوں تک میری سرپرستی میں کام کیا ہے۔ اس کی اپنی حیثیت کیا ہے؟ یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اس کمینے نے تین بار مجھے دھوکے سے پچھاڑا ہے۔ حقیقت کیا ہے اس کا اندازہ مجھے اور تھوڑا بہت آپ کو بھی ہے۔ لوگ بھلے ہی منہ پر میری تعریف کریں، پیٹھ پیچھے یہ کہتے ہی

ہوں گے کہ ایک گنوار اور معمولی پہلوان نے شیر خاں کو پچھاڑ دیا......'

'حضور! اب تو کوئی ایسا حربہ استعمال کرنا ہوگا کہ مُنّو کو ایک دم کمزور بنادیا جائے......
حضور اگر آپ کہیں تو نصرت بائی کے یہاں......'

'نصرت بائی......؟ لیکن کیوں؟'

'حضور آج کل مُنّو نصرت بائی کے سامنے والے مکان کی مرمت میں لگا ہے۔ نصرت بائی کسی مرد کو کمزور بنانے کے لئے کافی ہے۔'

پہلے تو شیر خاں نگاہ نیچی کئے کچھ سوچتے رہے۔ اس نے بعد منشی کا بغور جائزہ لیا ان کی چھڑی بل رہی تھی، دانت باہر نکلے ہوئے تھے اور ٹوپی کچھ ترچھی نظر آرہی تھی۔ اچانک شیر خاں اچھل پڑے۔

'واہ منشی جی! سوا لاکھ کی بات کہی ہے آپ نے۔ آپ آج ہی نصرت بائی کو لے کر یہاں آیئے۔'

'ہے......ہے......ہے......لیکن یہ گھر ہے حضور......'

'ارے سب ٹھیک کرلوں گا، آپ اسے لے کر گیارہ بجے رات میں سیدھے یہاں آجایئے۔'

رات ساڑھے گیارہ بجے نصرت بائی منشی جی کے ساتھ آئی تو شیر خاں نے اس کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ کچھ دیر تک رسمی گفتگو کرنے کے بعد شیر خاں نے اپنی تجوری سے تین ہزار روپے نکال کر نصرت بائی کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے روپیوں کو دیکھتی رہی۔

شیر خاں آرام کرسی سے اٹھ کر چہل قدمی کرنے لگے۔ دونوں منتظر تھے کہ شاید یہ کچھ کہیں۔ منشی جی اپنی زبان پھر سے کھولنا چاہ رہے تھے کہ شیر خاں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا:

'نصرت! تم اپنے کوٹھے کی منڈیر تڑوا دو اور اسے اپنے یہاں کا کام دے دو۔'

دوسرے دن نصرت بائی اپنے نئے کوٹھے کی منڈیر کو تڑوا رہی تھی تو سیما بائی پوچھنے لگی۔

'ہائے ایسا بھی کیا کہ نیا کوٹھا اجاڑنے پر لگی ہو، نیچے والے حصے میں بھی جگہ جگہ کھدوا رہی ہو۔'

نصرت بائی کو خاموشی سے یہ کام کرنا تھا اس لئے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ بڑی خوبصورتی سے ٹال گئی۔

جس دن سامنے والے مکان میں کام ختم ہوا، نصرت بائی کے یہاں مزدوروں نے کام شروع کر دیا۔ تین مزدور کام کر رہے تھے۔ مُنّو بھی ان میں سے ایک تھا۔ چھ دنوں تک نصرت بائی نے مُنّو پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی۔ لیکن بری طرح ناکام رہی۔ اب کام ختم ہونے والا تھا۔ مُنّو کو بہت کوشش کے باوجود وہ نہیں رجھا پا رہی تھی لیکن کوشش جاری رکھی...... اور پھر کسی طرح ایک دن وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی گئی۔ اب مُنّو دیر تک اس سے باتیں کرنے لگا تھا۔ جب نصرت اپنے ہاتھ سے کیک کا ٹکڑا اس کے منہ میں ڈالنا چاہتی تھی تو وہ انکار ہی نہیں کر پاتا تھا۔

آج رات دس بجے نصرت بائی شیر خاں سے ملنے آئی تو دونوں تقریباً تین گھنٹے تک ایک دوسرے سے گفتگو میں منہمک رہے۔ جب وہ جانے لگی تو شیر خاں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور نصرت بائی کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر دیر تک اس کے رخسار کی مصنوعی لالی مٹاتے رہے۔

جب وہ گھر لوٹ رہی تھی تو اس کے پرس میں پانچ ہزار روپئے تھے۔ ان دنوں شیر خاں

اس پر بہت زیادہ مہربان تھے۔ وہ نصرت کی ہر خواہش کو پورا کرنے میں لگے رہتے۔ لیکن ساتھ میں یہ دھمکی بھی دی جاتی کہ اگر شیر خاں اپنے منصوبے میں ناکام رہا تو نصرت کا قتل لازمی ہے۔

نصرت جانتی تھی کہ شیر خاں جیسے لوگوں کے لئے اس طرح کا قتل کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ وہ مُنّو جیسے لوگوں کا قتل نہیں کرا سکتے اس لئے کہ انہیں ہمیشہ یہ خدشہ لگا رہتا ہے کہ ایسے لوگ مرنے کے بعد امر ہو جاتے ہیں۔ ان کی یہ کوشش ہے کہ جیتے جی لوگوں کے دلوں میں مُنّو کا نام مر جائے۔

گذشتہ دس دنوں سے مُنّو کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ کھانسی کے ساتھ کچھ کچھ بخار بھی تھا۔ ان دنوں وہ کام پر بھی نہیں جا پا رہا تھا۔ گانٹھ میں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ کئی دنوں تک نصرت نے مُنّو کا انتظار کیا۔ جب وہ نہیں آیا تو تھک ہار کر وہ اس کے گھر پہنچی۔ مُنّو اب سینے کے درد سے کراہ رہا تھا۔ نصرت نے جب اس کی ایسی حالت دیکھی تو من ہی من بہت خوش ہوئی۔ لیکن ایسے وقت میں اس کے ساتھ ہمدردی سے پیش آنا بھی ضروری تھا۔ اس نے سینے سے ڈھلکتے ہوئے آنچل کو لاپرواہی سے سنبھالتے ہوئے پوچھا:

'کب سے تمہاری طبیعت خراب ہے؟'

'پندرہ تاریخ کو جب تمہارے گھر سے لوٹا تو راستے میں سردی لگی۔ کسی طرح گھر پہنچا۔ صبح اٹھنے کی کوشش کی تو بڑی کمزوری معلوم ہونے لگی۔ کچھ پیسے میرے پاس تھے۔ ڈاکٹر وہاب کے یہاں گیا تو انہوں نے پانچ دن کی دوا دے دی، دوبارہ دوا نہیں لا سکا۔

اور جب مُنّو نے ہاتھ بڑھا کر پیسے لینے کی کوشش کی تو نصرت نے اس کی انگلیاں زور سے دبا دیں، تب مُنّو نے مسکرانے کی ناکام کوشش بھی کی۔ پھر نصرت اور قریب آتے ہوئے بولی۔

'تم سے ایک زبردست شکایت ہے۔'

’کیوں؟‘

’تم نے منڈیر کو ٹھیک سے نہیں بنایا ہے۔‘

’لیکن اس میں گارا چونا تو پورا ڈالا تھا۔‘

’صرف گارا چونا ہی تو سب کچھ نہیں، دیکھنے میں بڑا بے ڈھب لگتا ہے۔‘

’ٹھیک ہے تمہیں پسند نہیں آیا تو پھر محنت کر دوں گا۔‘

اور جب نصرت جانے لگی تو مُنّو نے پوچھا:

’تم لکھنا پڑھنا تو جانتی ہی ہو......؟‘

’ہاں، کیوں کیا بات ہے؟‘

’تم سے ایک خط لکھوانا ہے۔‘

’کسے؟‘

’اپنی بیوی کو۔ تم ایک خط لکھ دو کہ ان دنوں میری طبیعت خراب ہے جتنی جلدی ہو سکے یہاں آجاؤ۔‘

نصرت کچھ دیر تک چھت کو دیکھتی رہی، پھر اس نے کہا۔ ’ٹھیک ہے تم اس کا پتہ دے دو، میں اسے خط لکھ دوں گی۔‘

’پتہ ہے...... محمد نظام میاں، گرام کٹونہ، پوسٹ خسرو پور۔ ضلع پٹنہ۔ خط کے اوپر ’عائشہ کو ملے، ضرور لکھ دینا۔‘

نصرت نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ راستے میں وہ سوچنے لگی کہ مُنّو دیکھتے ہی دیکھتے ایسا ہو گیا ہے کہ اگر کوئی اسے جھٹکے سے دیکھے تو پہچان بھی نہ سکے گا۔ اب وہ اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ زیادہ دیر تک بیٹھ بھی نہیں سکتا۔

اس رات نصرت بائی سو نہیں سکی۔ طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن کو جھنجھوڑ رہے تھے۔ وہ بار بار اٹھتی اور منڈیر کی طرف چلی جاتی۔ دیر تک سڑک کی ویرانیوں میں خود کو شامل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ اچانک ایک شرابی اس ویران سڑک پر نظر آیا، کچھ دور تک لڑکھڑانے کے بعد وہ ایک جگہ ڈھیر ہو گیا۔ رات کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے اس شخص میں وہ مُنّو کو تلاش کر رہی تھی۔

آج جب نصرت بائی شیر خاں کے گھر پہنچی تو وہ منشی جی کے ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ نصرت کی آمد پر شیر خاں نے بڑی سرد مہری سے کہا۔

'بیٹھ جاؤ۔'

نصرت نظریں جھکا کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر تک ماحول پر خاموشی چھائی رہی۔ منشی جی نے اپنی کرخت آواز میں سکوت توڑا۔

'سنا ہے مُنّو بہت زیادہ بیمار ہو گیا ہے؟'

'ہاں، میں اس کے گھر گئی تھی۔ وہ بستر پر پڑا کراہ رہا تھا۔ بہت کمزور ہو گیا ہے۔ اب تو وہ دیر تک بیٹھ بھی نہیں سکتا۔'

'حضور مُنّو کا اتنا زیادہ کمزور ہو جانا ہمارے لئے اچھا نہیں۔'

'آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں منشی جی۔'

'حضور، میرا جو کام تھا سو میں نے کر دیا۔'

'نہیں نصرت بائی، میں تمہیں کچھ نہیں کہتا، لیکن ابھی اصل کام پورا نہیں ہوا ہے۔'

'روپے کی کمی سے وہ دوا دارو بھی نہیں کر پا رہا ہے۔'

'میرا خیال ہے تم اس کی تیمار داری میں لگی رہو۔ جب تک وہ چلنے پھرنے کے لائق نہیں ہو جاتا ہم اسے لڑنے کی دعوت نہیں دے سکتے۔'

'لیکن اگر وہ صحت مند ہو گیا تو؟'

'اسے صرف چلنے پھرنے لائق ہونا چاہئے۔ جس روز وہ کام پر جانے لگے گا، میں سے چیلنج کروں گا۔'

'میں سمجھتی ہوں کہ اسے مکمل طور پر ٹھیک ہونے میں سال بھر لگ جائے گا، ان دنوں اس کی بیوی بھی یہاں نہیں ہے، ویسے اس نے مجھے اپنی بیوی کو خط لکھنے کو کہا ہے۔'

'تمہیں خط نہیں لکھنا ہے، بالکل نہیں لکھنا ہے۔' منشی جی ایک دم گھبرا گئے۔

جب نصرت گھر لوٹنے لگی تو اس نے شیر خاں سے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

'حضور، روپے گھٹ گئے ہیں۔'

'کمال کرتی ہو، دو مہینے میں میں تمہیں ہزاروں روپے دے چکا ہوں اور......'

'حضور، خرچ بھی تو لمبا چوڑا ہے۔'

'کیا کیجئے گا حضور، کچھ اور دے دیجئے۔ بیچاری آپ ہی کے رحم و کرم پر جی رہی ہے۔'

منشی جی نے سفارش کرتے ہوئے کہا۔

شیر خاں کچھ دیر تک کھڑے رہے، پھر دھیرے دھیرے اپنی تجوری کی طرف بڑھنے لگے۔

کچھ دنوں کی تیمار داری کے بعد نصرت بائی اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی۔ مُنّو کام پر جانے لگا۔ لیکن وہ اس حد تک کمزور ہوگیا تھا کہ دو تین گھنٹوں کے بعد ہی کافی تھک جاتا تھا اور اکثر اس کا سر بھی چکرانے لگتا تھا۔ جب شام کو گھر لوٹتا تو یہ امید ہوتی کہ بیوی بچے آگئے ہوں گے لیکن پھر وہاں خاموشی کا پہرا ہوتا اور وہ دیر تک مختلف خیالوں میں الجھنے کے بعد سو جاتا۔ ایک دن شام ڈھلے وہ اپنے گھر لوٹ رہا تھا تو محلے میں اس نے یہ اعلان سنا۔

'سنو...... سنو...... بھائیو سنو...... کل شام چار بجے سلیمان میاں کے اکھاڑے میں شاندار کشتی۔ کشتی جیتنے والے کو تین ہزار روپے کا انعام۔ ایک بار پھر دیکھیے شیر خاں اور مُنّو پہلوان کی ٹکر...... سنو...... سنو......!'

مُنّو گھبرایا ہوا شیر خاں کے گھر پہنچا۔ لیکن بہت کوششوں کے بعد بھی ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہوگیا تھا وہ۔

اس رات مُنّو سو نہیں سکا۔ بار بار اپنی شکست کی بھیانک تصویر دیکھ کر کانپ اٹھتا۔ 'یہ تو ظلم ہے، بزدلی ہے۔ مجھ جیسے کمزور شخص سے اگر وہ جیت بھی گیا تو...... کیوں نہ میں گاؤں چلا جاؤں۔'

صبح ہوئی تو ایک بار پھر مُنّو سیدھا شیر خاں کے گھر پہنچا۔ ان کے گھر پر کافی بھیڑ تھی۔ مُنّو نے جب ان سے بات کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے صاف لہجے میں کہہ دیا۔ 'اب اکھاڑے میں ہی ملاقات ہوگی۔'

مُنّو کو پھر نا کام لوٹنا پڑا۔

سلیمان میاں کے اکھاڑے کو بہت ڈھنگ سے سجایا گیا تھا۔ لوگ چاروں طرف جمع ہو رہے تھے اور ہر تھوڑی دیر کے بعد کشتی شروع ہونے کا اعلان کیا جا رہا تھا۔ آج اس اکھاڑے میں بڑی گہما گہمی تھی۔ مُنّو پہلوان کو مکمل یقین ہو گیا تھا کہ آج کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے گمنامی کے اندھیرے میں ڈوب جائے گا۔ جب کئی بار اعلان ہو چکا اور شیر خاں تنہا کھڑے ہوئے اکتا سے گئے تو چاروں سے طرف سے مُنّو پہلوان مردہ باد کے نعرے گونجنے لگے۔ اچانک اسی دوران کشتی کی تیاری کے ساتھ مُنّو پہلوان اکھاڑے کے ٹھیک بیچ میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ اور لوگ مُنّو کو ایک ٹک دیکھنے لگے۔ اس سے پہلے کہ کشتی شروع ہو، مُنّو نے ہاتھ جوڑ کر لوگوں سے کہنا شروع کیا:

'دوستو! میں اتنا کمزور ہو گیا ہوں کہ کسی بھی طرح ابھی کشتی لڑنے کو تیار نہیں تھا۔ اس بار میں نے شیر خاں کا چیلنج قبول بھی نہیں کیا تھا لیکن انہوں نے نہ جانے کیسے اعلان کروا دیا۔

اکھاڑے میں موجود بہت سارے لوگوں کو مُنّو کی یہ حالت دیکھ کر ہمدردی ہو گئی تھی اور ان میں بہتوں نے احتجاج بھی کیا تھا۔ لیکن ایک طرف سے جب مُنّو پہلوان مردہ باد کے نعرے پھر سے گونجنے لگے تو جوش میں مُنّو کشتی کے لئے تیار ہو گیا۔

پہلے راؤنڈ میں شیر خاں نے مُنّو پہلوان کو پچھاڑ دیا تو سبھی شیر خاں کی جے جے کار کرنے لگے۔ اسی طرح لگاتار تین بار مُنّو پہلوان کو زیر ہونا پڑا۔ اب چار راؤنڈ باقی تھے۔ چوتھی بار مُنّو نے اپنی پوری طاقت، ہمت اور مخصوص داؤ پیچ کا استعمال کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بقیہ چار راؤنڈ میں اس نے شیر خاں کو بری طرح پچھاڑ دیا۔

فیصلہ مُنّو پہلوان کے حق میں ہوا تو چاروں طرف سے اس کی جے جے کار ہونے لگی۔ مُنّو اکھاڑے کے بیچ میں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ لوگ چاروں طرف سے اسے گھیر چکے تھے۔ دیکھتے دیکھتے ایک لمبی بھیڑ مُنّو پہلوان کو اپنے دوش پر اٹھائے ہوئے چاروں طرف گھومنے لگی۔ مُنّو پہلوان زندہ باد...... مُنّو پہلوان امر رہیں...... مُنّو پہلوان......

آج شیر خاں کے ساتھ صرف منشی جی تیزی سے لپک رہے تھے، بھیڑ کا شور بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

تین چار گھنٹوں تک مختلف شاہراہوں سے مُنّو پہلوان کی جے جے کار کرتی ہوئی بھیڑ ہر لمحہ تیزی سے ساتھ پھیلتی جا رہی تھی۔ شیر خاں کی عمارت کے ٹھیک سامنے پھیلی ہوئی بھیڑ نے فلک شگاف نعرے بلند کئے۔ عمارت کے جس گوشے میں شیر خاں چھپنے کی کوشش کرتے۔ آوازیں ان کے وجود کو جھنجھوڑنے میں کامیاب ہو رہی تھیں۔ اچانک آوازیں بند ہوگئیں— شیر خاں نے باہر جھانک کر دیکھا تو بھیڑ اور بھی پھیل چکی تھی۔ پھولوں سے لدے مُنّو پہلوان کی جے جے کار لوگ اپنے ہاتھوں کو ہوا میں لہراتے ہوئے کر رہے تھے لیکن انہیں کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا— اسی بیچ کسی نے مُنّو پہلوان سے آکر زور زور سے چلا کر کہا:

'استاد ...... استاد...... غضب ہوگیا استاد ...... کسی نے ابھی ابھی نصرت بائی کا قتل کر دیا......'

یہ سنتے ہی مُنّو پہلوان نے شیر خاں کی عمارت کو بہت غور سے دیکھا۔ سبھوں کے سامنے اس پر تھوکا اور پھر بھیڑ کے ساتھ اپنے دل میں نیا عزم لئے دور تک دوڑتا رہا—

دوڑتا ہی رہا— ■

گڑیا

گڑیا بھی مجھے چھوڑ کر چلی گئی —

اب میں اس گھر میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں۔ دفتر سے جب اس جگہ لوٹتا ہوں تو چاروں طرف سے ایک عجیب تنہائی مجھ کر جکڑنے کی کوشش کرتی ہے۔ کچھ دیر اپنے آپ کو بہلانے کے بعد دھیرے سے بغیر کسی مقصد کے مختلف راہوں سے گزرنے لگتا ہوں۔ کبھی جھیل کی بانہوں میں — کبھی پہاڑوں کے دامن میں — اور پھر شہر کی مصروف ترین شاہراہ پر — ان مقامات سے گزرنے کے بعد رات — گہری رات ہو جاتی ہے، مجھے گھر کی طرف لوٹنا پڑتا ہے۔ یہاں بھی چاروں طرف اندھیرے کی حکومت ہوتی ہے، روشنی — ہلکی سی روشنی میری کسی انگلی کی جنبش سے پھوٹتی ہے — اور پھر کچھ دیر بعد وہی تاریکی — گڑیا ننھے ننھے پاؤں کے سہارے میرے پاس آتی ہے اور وہی سوال —؟

’پاپا —! ممی شاہد انکل کے ساتھ کیوں رہتی ہیں؟ وہ تو میری ممی ہیں نا —؟‘

’اچھی بیٹی کم بولتی ہے۔ چلو اب سو جاؤ۔ رات کافی ہوگئی ہے۔‘

’پاپا! آپ کیوں روتے ہیں۔ میں ممی کو منا کر لے آؤں گی وہ روٹھ گئی ہیں نا —؟‘

میں گڑیا کو تھپکیاں دینے لگتا ہوں۔ وہ اپنے آپ نہ جانے کیا کیا بول جاتی ہے۔ کبھی کبھی اس کی باتوں پر دھیان دیئے بغیر حامی بھر دیتا ہوں۔ وہ سو جاتی ہے میں اسے دیکھنے لگتا

ہوں۔ بالکل اپنی ممی کی طرح ہے— لیکن — کیا یہ بھی اسی کی طرح ہوگی؟ نہیں اس سے پہلے کہ ثروت کا ناپاک سایہ پڑے میں اسے — لیکن اس ننھی سی جان کا کیا قصور— شکل سے انسان پہچانا نہیں جاسکتا— ثروت بھی دیکھنے میں بھولی بھالی تھی۔ ہمیشہ اس طرح پیش آتی جیسے کہ اپنا سب کچھ اس نے صرف مجھ پر ہی قربان کیا ہو۔ پیار کے تمام قیمتی جواہر وہ میری پلکوں میں سجاتی رہتی تھی۔ اکثر میری آنکھوں کو چوم کر اس نے حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ جب کبھی بغور جائزہ لینے لگتا تو وہ اپنی پلکیں جھکالیتی یا پھر میری آنکھوں کو چوم کر پلکوں کو بند ہونے پر مجبور کردیتی۔ لیکن اسے کیا پتہ کہ ایک در بند ہوتا ہے تو دوسرا کھل جاتا ہے۔ اس کے سامنے اپنی قسمت پر رشک کرنے والا میں اسے دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میری مشکوک نگاہیں اکثر کسی تلخ حقیقت کا پتہ دیتی تھیں۔ اس نے اکثر محسوس بھی کیا لیکن اپنی خوشی چھن جانے کا خدشہ بھی تھا۔ ہم نے سمجھوتہ کرلیا۔ ایسا سمجھوتہ جہاں میں بری طرح ہار چکا تھا اور وہ اپنی جیت پر انجانے میں فخر کیا کرتی تھی۔

شاہد ہمارے بچپن کا دوست تھا۔ ہماری پانچ سالہ بیٹی اسے انکل کہا کرتی تھی۔ چونکہ شاہد نے ہمیں زندگی کی ڈھیر ساری خوشیاں دی تھیں اس لئے اس پر بھروسہ کرنا ہمارا فرض ہو چکا تھا۔ اور پھر انسان اکثر اس جگہ کمزور ہوجاتا ہے جہاں اسے عیش وعشرت کے سامان غلط ڈھنگ سے فراہم ہوتے ہیں۔ میں نے کبھی نہیں چاہا کہ شاہد گڑیا کو قیمتی کھلونے لاکردے۔ میری بیوی ثروت کے لئے ہزاروں روپئے کے کپڑے لائے اور میری آسائش کا بھی خیال رکھے۔ میں اسے منع تو کرتا لیکن اس کے ٹال دینے کا انداز اتنا خوبصورت تھا کہ کوئی بھی شخص اس کی ضد کے آگے سر جھکا سکتا تھا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ گڑیا کی پانچویں سالگرہ پر اس نے اپنے ان دوستوں کو بلایا جو اچھے عہدے پر فائز تھے۔ جب میرا تعارف ان سے کرایا گیا تو کلرک ہونے کا قصہ بھی لوگوں کو بتایا گیا۔ یہ درست ہے کہ شاہد نہیں ہوتا تو شاید میں معمولی کلرک بھی نہیں ہوپاتا۔ گڑیا کی سالگرہ پر ثروت نے ایک قیمتی ساڑی پہن رکھی تھی۔ اتنی قیمتی جسے میں اپنے مہینے

بھر کی تنخواہ سے بھی نہیں خرید سکتا تھا۔ شاہد نے فارن سے ساڑی اسی تقریب کے لئے منگوائی تھی۔ میں اشارتاً جب اس سے کہتا کہ تم شاہد کے تحفے لینا بند کردو تو وہ ایک بار پھر میری کمزوری کا ناجائز فائدہ اٹھاتی۔ مجھے جذباتی باتوں میں الجھا کر اپنے چہرے پر کرب و ملال کی ہلکی سی چادر تان لیتی۔ میں اس چادر کو دھیرے دھیرے ہٹاتا اور پھر ماحول پہلے ہی جیسا ہونے لگتا۔

اسی بیچ اچانک میرا ٹرانسفر ہوگیا۔ نئی جگہ ایسی ملی جہاں ثروت اور گڑیا کو فوراً نہیں بلایا جاسکتا تھا۔ میں اس کوشش میں لگا رہا کہ کسی اچھے محلے میں کرائے پر کوئی مکان مل گیا تو ان دونوں کو بھی اپنے پاس بلالوں گا۔ میں کسی طرح ایک چھوٹے سے کمرے میں گزر کر رہا تھا۔ کرائے کا مکان تلاش کرتے ہوئے چھ ماہ گزر گئے ثروت ہمیں خط لکھتی رہی۔ میں اسے جواب اور منی آرڈر بھیجتا رہا۔ بعد میں اس نے اپنا خرچ بڑھادیا اور کم از کم دو ہزار روپے اور طلب کرنے لگی۔ میں اپنی آمدنی کو دیکھتے ہوئے اس کی تمام خواہشیں پوری نہیں کرسکتا تھا۔ سوچا کہ خود جاکر اسے سمجھانا پڑے گا۔ ایک بار جب اس نے منی آرڈر واپس کردیا تو مجھے بہت تکلیف پہنچی۔ اور جب گھر پہنچا تو وہ زبردستی مجھ سے طلاق چاہنے لگی۔ اس کی خواہش پوری ہوئی۔ مقدمے کے بعد گڑیا میرے حصے میں آئی — طلاق کی وجہ اس وقت سمجھ میں آئی جب تقریباً چھ مہینے بعد شاہد کی دوسری بیوی کی شکل میں ثروت نے اس کی زندگی میں قدم رکھا۔

مجھے اس بات کا افسوس ضرور تھا کہ ثروت نے ان گہرائیوں میں ڈوبنے کی کوشش نہیں کی جہاں زندگی کی جائز اور صحیح خوشیاں حاصل ہوتی ہیں۔ میں اپنی کسی الجھن میں اسے شامل نہیں کرتا تھا۔ صرف اس لئے کہ وہ ہر وقت سطحی خوشیوں کے بارے میں ہی سوچا کرتی تھی۔ پتہ نہیں کس جگہ میں غلط ثابت ہوا لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میں ساری زندگی اپنی شخصیت کو مختلف خانوں میں نہیں بانٹ سکتا تھا جبکہ زندگی میں رنگ جمانے کے لئے ایک ہی شخص کو کئی چہروں کی ضرورت ہوتی ہے۔

اب شاہد ہمارے گھر نہیں آتا تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر کلرکی سے استعفیٰ دے دیا تھا اور ایک دکان میں سلیز مین ہوگیا تھا۔ گڑیا اپنے پرانے کھلونوں سے کھیلا کرتی تھی۔ دھیرے دھیرے میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر ایسا وقت آیا جب میری ننھی گڑیا ہی میرے لئے سب کچھ ہوگئی۔ میں آنکھیں بند کر کے اس کی آواز بھی سنتا ہوں۔ اب بھی سن رہا ہوں۔

'پاپا! میرے سب کھلونے ٹوٹ گئے ہیں — نہیں نہیں تم اداس مت ہو۔ میں ضد نہیں کروں گی۔ اب تو بڑی ہوتی جارہی ہوں۔ ممی ایک بار آکر سکھا جاتی کہ کھانا کیسے بنایا جاتا ہے۔ کس طرح کپڑے صاف کرتے ہیں، لیکن نہیں — ممی تو بہت بری ہے وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی شاہد انکل کے پاس بڑا بنگلہ ہے۔ سچ مچ کی موٹر بھی ہے پاپا، ممی تو موٹر میں گھومتی ہوگی —؟'

میں جان بوجھ کر اپنی آنکھیں اس طرح بند کرلیا کرتا تھا کہ وہ یہ سمجھ لے کہ میں سوچکا ہوں۔ میرے پتھر جیسے سینے پر اپنے ننھے ننھے ہاتھوں کے زور سے مجھے جگانے کی کوشش کرتی اور جب میں اس کے لئے جگ جاتا تو پریوں یا راجاؤں کے دیس کی کوئی کہانی سنانے لگتا۔

کسی ملک میں ایک بادشاہ تھا۔ اس کے پاس صرف ایک بیٹی تھی۔ شہزادی بچپن میں بہت عقلمند تھی۔ لوگ اسے بہت پیار کرتے تھے لیکن جب وہ بڑی ہوگئی تو اس نے تمام بری عادتوں کو اپنالیا۔ چونکہ ماں نہیں تھی اسے بھرپور پیار کون دیتا۔ بادشاہ کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ شہزادی کی خود بھی دیکھ بھال کرتا۔ بڑی ہوکر وہ کافی ضدی اور بددماغ ہوگئی۔ دھیرے دھیرے اس نے اپنی حرکتوں سے بادشاہ کو بدنام کرنا شروع کردیا اور......

گڑیا اس دوران سوچکی تھی۔ میں کہانی کہنے کے بعد دیر تک اس کی اچھی بری باتوں کو سوچتا رہتا — اس کہانی میں بادشاہ نے ایک سخت جرم کے الزام میں شہزادی کو شہر بدر کردیا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے گڑیا سات سال کی ہوگئی۔ لیکن اس میں ایک زبردست تبدیلی آگئی کہ وہ بالکل خاموش رہنے لگی۔ لاکھ بہلانے پر بھی کوئی خاص اثر نہیں پڑتا تھا۔ ایک دن جب وہ

اسکول سے واپس آئی تو میں گھر ہی میں تھا۔ اس نے کئی بار مجھ سے سر درد کی شکایت کی تھی میں نے اس روز سوچا کیوں نہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔ جب وہ ڈاکٹر کے یہاں جانے کے لئے تیار ہو کر آئی تو اس روز بالکل ثروت کی طرح لگ رہی تھی۔ میرے دل میں نفرت کا جذبہ ابھرا۔ پھر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا — رفتہ رفتہ وہ زیادہ تر بیمار رہنے لگی۔ جب بھی اسے دوا دینے جاتا تو اس کے چہرے کے ہر زاویے سے ثروت کی جھلک ملتی۔ اور میں کسی طرح دوا دے کر اپنے کمرے میں آجاتا۔ نہ جانے کیوں اب گڑیا سے دور رہنے میں ہی سکون محسوس ہونے لگا تھا۔ اب وہ میرے سینے پر سر رکھ کر سونے کو میرے کمرے میں نہیں آسکتی تھی۔ وہ زیادہ بیمار رہنے لگی۔ ڈاکٹر نے بہت احتیاط برتنے کو کہا اور ہر وقت مجھے اس کے قریب رہنے کی ہدایت دی۔ رات کو دوائیں دے کر کبھی کبھار اسی کے پاس سو جاتا۔ گڑیا کی خاموشی بڑھتی گئی وہ اکثر نیند میں اپنی ماں کو پکارتی اور پھر سسکنے لگتی۔ کئی ماہ گزر گئے۔ یہی سلسلہ چلتا رہا۔ میں اپنی بیٹی گڑیا کی زندگی کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔ لیکن ان دنوں جب اس کے چہرے کو دیکھتا تو ثروت کا کردار میری نظروں کے سامنے گھوم جاتا اور میں گڑیا سے دور ہونے لگتا — رات کے دو بجے اسے دوا دینی ضروری تھی۔ میں تیار بھی ہوا۔ جب اس کے قریب پہنچا تو وہ سوئی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے جگا کر دوا دینے کو کہا تھا۔ جیسے ہی اس کے چہرے کو چھونا چاہا مجھے ایسا لگا کہ اب کوئی گناہ سرزد ہونے والا ہے۔ میری گڑیا سوئی تھی لیکن ثروت ذہن کے نہاں خانوں میں لگاتار دستک دے رہی تھی۔ میرے ہاتھ سے دوا کی شیشی چھوٹ گئی۔ شیشے فرش پر بکھر گئے۔

صبح میں جگ گیا لیکن گڑیا نہیں جگ سکی۔ میں اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھ سے ہمیشہ کے لئے روٹھ چکی تھی۔ اسے دیکھ کر پل بھر کے لئے ایسا بھی لگا کہ آج میں نے اپنے تصور کی گڑیا کو ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا ہے اور ثروت سے نجات حاصل ہوگئی ہے۔ گڑیا تو صرف دیکھنے کی چیز ہے اس پر کسے پیار نہیں آتا؟

پھر آنکھیں کھولیں۔ اب بھی اندھیرا تھا نہ جانے کب صبح ہوگی؟ ■

گینی پگ

اس عمارت میں بسے ہوئے لوگ ملک کی سرحدوں سے باہر بھی پھیلے ہوئے تھے۔ جو بھی اس شہر میں جاتا زیارت کے لئے اس مقام پر ضرور پہنچتا۔ عمارت میں داخل ہونے کے لئے کئی دروازے تھے لیکن عام آدمیوں کو ہر دروازے سے داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر کوئی زبردستی جانا بھی چاہتا تو گارڈ اسے دھکے دے کر باہر نکال دیتا۔

شام ہوتے ہی کچھ خاص دروازے کھلتے۔ آسمانوں سے زمین پر اترنے والی پریاں دکھائی دیتیں۔ پائل کی جھنکار ماحول میں موسیقیت بھر دیتی۔ گارڈ انہیں بہت احترام کے ساتھ اپنے اپنے کمرے کی طرف جانے کا اشارہ کرتا۔ پریاں کھلکھلا اٹھتیں گارڈ مسکرا دیتا۔ پھر کچھ اور دروازے رات کے پچھلے پہر کھلتے۔ اس میں دوسری دنیا کے مخصوص لوگ داخل ہوتے۔ اندھیری رات میں بھی ان کی آنکھوں میں کالا چشمہ ضرور ہوتا۔ لباس سے پھوٹتی ہوئی خوشبو بہت دیر تک ہوا میں تحلیل ہوتی رہتی۔ کئی گارڈ انہیں سلامی دیتے۔ اکثر لوگوں کے پاس بریف کیس ضرور ہوا کرتا اور جب وہ دروازے سے باہر نکلتے تو صبح ہو چکی ہوتی۔ اب ان کی آنکھوں پر نہ کالا چشمہ ہوتا نہ ہی بریف کیس۔ معاملہ کچھ عجیب تھا۔

اس روز عمارت میں ہنگامہ ہوا۔ لوگوں کی بھیڑ بڑھتی گئی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے پر کسی بہت ہی خوبصورت کار سے کوئی ڈاکٹر اترتا اور اس عمارت کے مالک رائے جنگ بہادر کے کمرے کی طرف لپکتا۔ جنگ بہادر بہت بوڑھے ہو چکے تھے اور آج ان کا دل دورے پر تھا۔

ڈاکٹروں کی لگاتار کوششوں سے کسی طرح انہیں بچایا گیا۔ بھیڑ دھیرے دھیرے کم ہوئی اور ان کی دنیا پہلے کی طرح آباد ہوگئی۔

دوسرے روز انہوں نے اپنے چاروں بیٹوں کو کمرے میں بلایا، اس لکڑہارے کی طرح جو مرنے سے پہلے اپنے بیٹوں کو متحد ہونے کی نصیحت دے گیا تھا۔ سبھی بوڑھے باپ کے پاس بہت احترام سے کھڑے ہوگئے۔ بوڑھا ان سے الگ الگ مخاطب ہوا۔

'رائے انگ بہادر، یاد رہے تم کو اس دیش کا سب سے بڑا بیوپاری بننا ہے۔ اپنے کاروبار کو دور دور تک پھیلانے کے لئے تمہیں ہر ممکن قدم اٹھانا ہے، وقت پڑنے پر ناممکن بھی۔ تالاب کی بڑی مچھلی کی پہچان اسی وقت ہوتی ہے جب وہ تمام چھوٹی مچھلیوں کو نگل جائے۔ بدیشی بیوپاری بھی ہماری بہت مدد کر رہے ہیں ہماری ساکھ دن بہ دن مضبوط ہونی چاہئے۔'

پھر بوڑھا دوسرے بیٹے کے پاس پہنچ کر کہنے لگا۔

'رائے دنگ بہادر تم ہماری ریاست کے ذمہ دار سیاست دان ہو۔ ہم نے تم پر بہت اہم ذمہ داری سونپی ہے۔ تم جنتا کی آشا ہو۔ انہیں کبھی یہ پتہ نہیں چلنا چاہئے کہ ان کے پاؤں کے نیچے زمین نہیں۔ جس روز ان میں یہ احساس جگ گیا سمجھ لینا ہم اب محفوظ نہیں۔ ہمارے پرکھوں کی شان پل بھر کے لئے بھی کھونے نہ پائے۔ میں بہت بوڑھا ہوگیا ہوں۔ تمہیں خود ہی ان راہوں پر چلنا ہے۔'

اب بوڑھا تیسرے بیٹے کے سامنے کھڑا تھا۔

'رائے رنگ بہادر تمہیں جو کام میں نے سونپا ہے، جانتا ہوں، بہت کٹھن ہے لیکن پرچار اور پرسار سے سب کچھ ممکن ہے۔ آج دنیا کے ہر دیش میں لوگ تمہارا پروچن سنتے ہیں اور بھکتی کی بھاونا میں ڈوبے ہوئے بھی ہیں۔ ہم معمولی تبدیلی کے بعد ساری دنیا میں ایک نیا دھرم

پھیلانا چاہتے ہیں تا کہ ہر گھر میں بھگوان کی جگہ ہماری تصویریں ہوں۔ چاہے اور جو بھی مارگ چننا پڑے لیکن ان کے دلوں میں شردھا کی بھاونائیں پیدا کرنی ہیں۔ اپنے بنائے ہوئے دھرم کے اصولوں پر سبھوں کو چلنے کے لئے مجبور کرنا ہوگا لیکن اس کے لئے تمہیں زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں فلسفے کی کچھ کتابیں ضرور پڑھ لو۔ جو بات آسانی سے سمجھی جاسکتی ہے اسے اور الجھاؤ تا کہ اس میں نیاپن معلوم ہو کہ ساری دنیا آدھونکتا کی طرف بھاگتی ہے۔'

بوڑھا اپنے چھبیس سالہ بیٹے وجے سے مخاطب ہونے سے پہلے خاموش ہوکر اسے گھورتا رہا۔ بوڑھے کو دکھ تھا کہ وجے نے اچانک اپنا روایتی نام کیوں بدل ڈالا۔ بنا کسی خاص مقصد کے اونچی تعلیم کیوں حاصل کر رہا ہے؟ ایسی کتابیں جو ہمارے خلاف لکھی گئی ہیں، اکثر اس کے ہاتھ میں کیوں دکھائی دیتی ہیں۔ وہ لوگ جو ہمارے مخالفین ہیں، اس کے دوست کیوں ہیں؟ یہ اس عمارت کا اہم حصہ ہوکر بھی ہم سے الگ کیوں ہے؟ پھر بوڑھے کی سوچ نے بولنا شروع کردیا۔

'وجے...... تعلیم بہت اچھی چیز ہے لیکن دنیا بھر کی بکواس کتابیں پڑھنے کی تمہیں کیا ضرورت ہے— تم ان کتابوں اور فٹ پاتھ کے لوگوں کی وجہ سے میری دنیا سے ایک دم الگ ہوتے جارہے ہو۔ ابھی تم جوان ہو اس لئے خون گرم ہے۔ ٹھیک ہے اگر تمہیں یہی اچھا لگتا ہے تو میرا اسندیش اپنے جیسوں تک پہنچانے کا کام کرو تا کہ تم جیسے لوگ بھی ہمارے بھکت ہو جائیں اور زندگی میں یہ ڈگر تمہیں جب بھی کٹھن معلوم ہو اپنا اصل نام دنیا کے سامنے پیش کر کے بھائیوں کے کاموں میں ہاتھ بٹانا۔ ویسے مجھے تمہارا یہ نام سرے سے پسند نہیں۔'

وجے نے اپنے باپ کے سامنے کبھی منہ نہیں کھولا تھا لیکن اس روز اس نے کافی ہمت جٹا کر یہ کہہ دیا کہ — 'میں اب اپنا نام بدلنے والا نہیں ہوں۔'

وجے کے اس تیور پر دوسرے لوگ بھی چونک پڑے۔ باپ کا دل ایک بار پھر تیز رفتاری

سے دورے پر تھا۔ وجے کو بہت سمجھانے کی کوششیں کی گئیں لیکن سمسیا اور بھی گمبھیر ہوتی گئی۔

دوسرے روز شام ہوتے ہی اچانک عمارت کو چاروں طرف سے لوگوں نے گھیر لیا۔ بھیڑ دھیرے دھیرے بڑھتی جارہی تھی۔ کئی دنوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ریاست کے ہر حصے سے لوگ اپنے اپنے مسائل کے ساتھ پہنچ رہے تھے۔ اس بھیڑ کو دیکھ کر عمارت کا ہر شخص دہشت زدہ تھا۔ لیکن بوڑھا بہت پریشان نہیں ہوا۔ اس مسئلے کے حل کے لئے چاروں بیٹوں کو اپنے کمرے میں بلایا، تین بیٹے تو آئے لیکن وجے ان میں نہیں تھا۔ عمارت میں اسے تلاش کیا جانے لگا۔ بوڑھا تینوں کے ساتھ خفیہ میٹنگ میں مصروف ہوگیا۔ دیر تک حکمت عملی طے کرنے کے بعد بوڑھے نے انہیں عمارت کے اس حصے میں بھیج دیا جہاں سے عوام کو دیکھا جاسکتا تھا۔ لیکن بہت قریب ہونے کے باوجود جنتا انہیں چھو نہیں سکتی تھی۔ تینوں ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوگئے۔ بھیڑ سے آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ہر شخص کی آنکھوں میں خون ابھر رہا تھا۔ ان کے پاس ڈھیر سارے مسائل تھے۔ کسی نے کہا۔

'کل ہماری جوان بیٹی کو تمہارے آدمی یہاں اٹھا کر لائے تھے۔ اسے تم لوگوں نے نوچ نوچ کر مار ڈالا۔ اسی کی لاش کے ساتھ آج یہاں آیا ہوں۔ مجھے بتاؤ کس جرم کی سزا ہے؟'

دوسری آواز: 'ہم جانتے ہیں کہ ہمارے شہروں کے دنگوں میں تم ہی شامل ہو۔ تم نہیں چاہتے کہ ہم چھوٹے کاروباری اپنی لگن اور محنت سے آگے بڑھیں۔ تم نے اپنے مفاد کی خاطر ہمارے رشتوں میں زہر بھر دیا ہے۔'

تیسری آواز: صرف دو وقت کی روٹی کے لئے ہمارے جوان بیٹوں نے تمہارے دھرم کو سویکار کرلیا ہے۔ تمہارا دھرم ہم سبھوں میں دہشت پھیلا رہا ہے۔ ہمارے بیٹے ہی دشمن ہوگئے ہیں ساری انسانیت کے۔ میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔ تم انہیں چھوڑ دو۔'

آوازیں اسی طرح گونجتی رہیں۔ قانون...... روٹی...... ریپ...... دھرم...... بھاشا......
نوکری اور ایسے ہی مسائل ابھرتے رہے۔ تینوں کے سامنے ان مسئلوں کا حل تھا۔ ہاتھ جوڑ کر جنتا کے سامنے کھڑے رہنا اور ہوا بھی یہی۔

پھر ان کے بیان کے مطابق سبھوں کو دہشت گرد قرار دیا گیا۔ پھر آنسو گیس...... گولیاں ...... کرفیو...... قتل...... بم اور کچھ اخباروں پر پابندیاں۔ تب بظاہر معاملہ کچھ دب سا گیا۔

بوڑھا سمجھ چکا تھا کہ اس بغاوت کے پیچھے وجے کا ان لوگوں کو بھرپور تعاون حاصل ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ساری باتیں عوام تک پہنچ جاتی تھیں۔ بوڑھا ایک بار پھر فکرمند نظر آنے لگا اور اس نے تنہائی میں وجے کو بلا کر اپنی سطح پر بہت کچھ سمجھانے کی کوششیں کی۔ تب بھی اس نے بوڑھے کے سامنے اس کے اصولوں سے کوئی مخالفت نہیں کی۔ لیکن بوڑھے کی تجربہ کار آنکھیں وجے کے اندر سلگتی ہوئی چنگاریوں کو شدت سے اپنے اندر جذب کرنے لگیں۔ آئے دن عمارت پر کوئی نہ کوئی پتھر پھینکا جاتا۔ کسی نہ کسی کھڑکی کا شیشہ چور ہو جاتا۔ کبھی کبھی کرچیاں بوڑھے کے وجود کو چھو جاتیں اور وہ تلملا اٹھتا۔ تینوں بیٹے بہت تجربہ کار نہ ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ پریشان رہنے لگے۔ انہیں اپنا مستقبل تاریکی میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ تینوں سہمے ہوئے تھے کہ کہیں ان کا قتل نہ کر دیا جائے...... بوڑھا بھی ہر وقت کسی سوچ میں ڈوبا نظر آنے لگا۔

جب وجے کے کمرے میں عام آدمیوں نے آنا جانا شروع کر دیا تو بوڑھے کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جبکہ اس کے تینوں بیٹے بہت حد تک مطمئن نظر آنے لگے کہ انہیں عام لوگوں سے دھیرے دھیرے اپنے تعلقات بہتر نظر آنے لگے۔ بوڑھا ان کی سطحی سوچ سے مایوس ہو گیا۔ اسے یہ بھی احساس ہونے لگا کہ ممکن ہے ہماری نسل کا اب زوال آ جائے۔ پھر بھی بوڑھے کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا...... اور ایک رات پھر اس عمارت میں کئی بڑے ڈاکٹروں

کو داخل ہوتے ہوئے دیکھا گیا۔ عمارت کے باہر کی دنیا نے سمجھا کہ بوڑھے پر پھر دل کا دورا پڑا ہے۔ دیش کے کچھ بڑے اخبارات بھی یہی بول رہے تھے لیکن اس بار بوڑھا بالکل ٹھیک تھا۔ وہ گھنٹوں ڈاکٹروں سے تبادلہ خیال کرتا رہا اور بالآخر وجے کو مکمل طور پر پاگل قرار دیا گیا۔

جب وجے کو اپنے پاگل ہونے کی خبر ملی تو وہ زور زور سے چلانے لگا۔ اسی بیچ بے ہوشی کا انجکشن دیا گیا اور پھر رات کے پچھلے پہر اسے پاگل خانے پہنچا دیا گیا۔

ہوش آنے پر اس نے پاگل خانے کی دیواروں سے سر ٹکراتے ہوئے کہا— 'میں پاگل نہیں ہوں۔ میں ایک بھیانک سازش میں جکڑ لیا گیا ہوں۔'

دیواریں بول سکتی تھیں لیکن انہیں بولنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ کبھی کبھی یہ اس کی دیوانگی کو دیکھ کر رونا چاہتیں لیکن ان سے تمام آنسو چھین لئے گئے تھے۔ جب وہ ان پاگلوں کی دنیا میں یہ کہتا کہ میں بھیانک سازش کا شکار ہو گیا ہوں تو دوسرے پاگل اس کا مذاق نہیں اڑاتے بلکہ اپنے انداز سے اس سے ہمدردی سے پیش آتے۔ یہ عجیب سی دنیا تھی۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی لگتا کہ جیسے یہ تجربہ گاہ ہو اور اس میں رہنے والے لوگ گینی پگ ہیں۔ جب وہ روتے روتے تھک جاتا تو دیواریں بہت غور سے اسے دیکھنے لگتیں۔ وہ اسے تھپکیاں دینا چاہتی تھیں لیکن یہ بھی ممکن نہ ہو سکا کہ انہیں اپنی جگہ سے ایک قدم بھی آگے بڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔

اب ایک بار پھر پرشکوہ عمارت میں بسے ہوئے لوگ دیش کی سرحدوں سے باہر بھی دور تک پھیلنے لگے۔ عمارت زیارت گاہ بنی۔ کالے چشمے والا آدمی جواں ہوتی ہوئی رات میں آنے لگا۔ آسمانوں سے اترانے والی پریاں عمارت کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کھلکھلانے لگیں اور گارڈ پہلے کی طرح مسکرانے لگا۔

کچھ مہینے گزر جانے کے بعد پاگل خانے کے نظام میں خصوصی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

اب اس جگہ شور بہت کم ہوگیا تھا۔ سبھی اداس اداس سے رہنے لگے تھے۔ وجے بھی ایک دم خاموش ہوگیا تھا۔ اب وہ کسی کو پہچانتا بھی نہیں تھا۔ بوڑھا پاگل خانے آتا اور دیر تک اپنے بیٹے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتا رہتا۔ پھر تینوں بھائی آتے اور پنی بے پناہ محبتیں بکھیرتے لیکن وجے پر اس دوران کوئی ردعمل نہیں ہوتا۔ خاموشی اور صرف خاموشی۔ کچھ دیر بعد بوڑھا باپ اور تینوں بھائی اس کی نظروں سے دور جانے لگتے تو وہ انہیں دیر تک جاتے ہوئے ضرور دیکھتا رہتا پھر نہ جانے کیوں خود بخود آنکھیں بھر آتیں ...... اب دیواریں خود کو توڑ دینا چاہتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ ماحول کی ہر شئے اس کی ایک آواز پر وجد کرنے کے لئے تیار تھی۔ ہر لمحہ نئی دنیا بسانے کے ساتھ دھڑکنیں اس کے ذہن میں منتقل ہونے لگیں۔ اور وہ اسی بیچ سچ مچ پاگل ہوگیا۔

اب اس کی روتی ہوئی آنکھوں اور پھیلی ہوئی خاموشی نے دیواروں سے سرگوشیاں کیں۔ دیواریں باہری دنیا میں بسنے والے انسانوں کو یہ داستان سنانا چاہتی تھیں لیکن کسے فرصت تھی؟ دور تک انسانوں کا سیلاب پھیلتا ہی جارہا تھا۔ اسی دوران دیواروں کا حصار بھی ختم ہوگیا۔ لیکن وجے اسی مقام پر کھڑا رہا کہ شاید لوگ اسے پہچان لیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ چاروں طرف سے پتھر ہی برسے۔ اور پھر دور تک بے حسی کے سوا اسے کچھ بھی نظر نہیں آیا...... تب ہی ایک بے پناہ اندھیری رات میں اس کا بوڑھا باپ اپنے تینوں بیٹوں کے ساتھ ابھرا۔ وجے کو دیکھ کر مطمئن ہوا۔

پرشکوہ عمارت میں، آج بوڑھے نے زبردست جشن کا اہتمام کیا تھا۔ پریوں، کالے چشمے والے آدمیوں، ڈاکٹروں، سیاست دانوں، تاجروں اور مذہبی رہنماؤں نے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ وجے اپنے لئے تعمیر کردہ اس خوبصورت تجربہ گاہ میں ان کی ہتھیلیوں پر خود کو جھکا ہوا محسوس کرتا ہے — اور ایسے میں زمین اب بھی گھوم رہی تھی — ■

تجارت

شہر کے سب سے بڑے تاجر ماتھر صاحب سے کوئی بھی چھوٹا کاروباری بہت قریب رہنا چاہتا تھا لیکن ماتھر صاحب کی شخصیت کچھ ایسی تھی کہ کوئی بھی ان کے قریب رہ کر شاید خود کو زیادہ دیر تک نہیں چھپا سکتا تھا۔ انہیں اپنے لئے بکھرے ہوئے خلوص اور عزت کا پس منظر اچھی طرح معلوم تھا۔ شاید اسی لئے انہوں نے اپنی زندگی کے اس پہلو کو جہاں کسی ہمدرد کی ضرورت ہوتی ہے، بہت سنبھال کر رکھا تھا۔

زندگی نے یوں تو بہت کچھ دیا تھا لیکن ایک گہری خاموشی نہ جانے کس دلدل میں انہیں لئے جا رہی تھی۔

بہت ہی خوبصورت حویلی، آرام و آسائش کا بھرپور نظم ایک آواز پر کئی جھکے ہوئے چہرے۔ لیکن یہ سب ان کے کسی روحانی جذبے کی نشاندہی نہیں کیا کرتے تھے۔ سب کچھ کاروبار کا ایک حصہ تھا۔

ماتھر صاحب پچاس کے ہوئے لیکن اب تک شادی کیوں نہیں کی؟ وہ اس شاندار حویلی میں تنہا کیوں رہتے ہیں؟ جبکہ شہر میں ان کے رشتہ دار بھرے پڑے ہیں؟ ان کی ذاتی زندگی سے متعلق سوال کرنے کی کوئی بھی ہمت نہیں کر پاتا تھا۔ ہاں خوش گپیوں کے لئے یہ سب موضوع بحث ضرور ہوا کرتا تھا کہ شاید انہیں گہری چوٹ لگی ہے۔ ضرور کوئی بھنور میں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

میں بھی کئی دنوں سے چاہ رہا تھا کہ ماتھر صاحب سے ملاقات کروں لیکن ان کی شخصیت کے بارعب پہلو سے متعلق جو باتیں سن رکھی تھیں ان سے میرے بونے قد کا احساس اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔ یہ بھی سوچتا کہ ماتھر صاحب اگر نہ بھی مل پائے یا پھر انہوں نے میرے ساتھ بہتر سلوک نہیں بھی کیا تو کیا فرق پڑتا ہے؟ میری حیثیت میں تو کہیں کوئی تبدیلی نہیں آنے والی۔ شاید یہی سوچ کر میں اپنے گھر سے نکلنا ہی چاہ رہا تھا کہ ٹھیک دروازے سے باہر نکلتے ہوئے بیوی نے حسب معمول ٹوک دیا۔

'اجی سنتے ہو، یہ تمہاری کیا عادت ہوگئی ہے کہ اب جاتے وقت کہتے بھی نہیں کہ جا رہا ہوں۔'

'یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے اب جا رہا ہوں، تو جا رہا ہوں، بس......'

'آج سیما کے کالج میں فنکشن ہے اسے لوٹنے میں شام کے چھ بج جائیں گے تم ساتھ لئے آنا......'

میں فرنیچر کی اپنی چھوٹی سی دکان کو نیا روپ دینے کی کوشش کئی برسوں سے کر رہا تھا جو آج بھی جاری تھی۔ دن بھر کی کڑی محنت کے بعد شام میں سیما کے کالج گیا۔ اسے لے کر ماتھر صاحب کے دفتر پہنچا تو وہ اپنی کار میں بیٹھ کر شاید اپنی حویلی کی طرف جانے کے لئے تیار تھے، انہیں رخصت کرنے کے لئے کئی لوگ ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔

'سر...... مجھے آپ سے ملنا تھا...... ایک دم ذاتی کام تھا سر...... تھوڑا وقت اگر دے سکیں تو......' میں ہمت کر کے ان کے پاس پہنچ گیا۔

'آپ کل دفتر آجائیں۔' ماتھر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہہ کر ہم دونوں پر مشفقانہ نظر ڈالی۔

'سر...... دفتر کا کام ...... نہ...... نہیں تھا سر......' پھر انہوں نے مجھے اپنی کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میرے لئے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ میں نے ماتھر صاحب کے دفتر میں ہی اپنا اسکوٹر پارک کیا اور پھر ہم دونوں پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

'یہ بچی کون ہے؟' انہوں نے منہ ادھر کئے ہی بارعب انداز میں پوچھا۔

'سر......! یہ...... ہماری بیٹی ہے سیما۔'

پھر کار رینگنے لگی۔ ماتھر صاحب نے پائپ سلگاتے ہوئے چند لمحوں تک میری طرف دیکھا اور پھر باہر کے گزرتے ہوئے مناظر کا جائزہ لینے لگے۔ کیسے بات شروع کروں سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ماتھر صاحب بول پڑے۔

'شری مان جی! آپ نے اپنا پریچے تو دیا ہی نہیں......'

'اوہ، ہاں سر...... میں ہوں جیتندر پرساد، میرا چھوٹا سا بزنس ہے، میں اس شہر میں کئی برسوں سے اسٹرگل کررہا ہوں۔ فرنیچر کا چھوٹا موٹا کاروبار ہے'

وہ کچھ دیر خاموش رہے تو میں یہ سوچ کر کچھ نروس سا ہونے لگا کہ کہیں وہ ڈرائیور سے گاڑی روک دینے کے لئے نہ کہہ دیں، لیکن انہوں نے تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد خود ہی سکوت توڑ دیا۔

'کمال ہے...... فرنیچر کے تمام چھوٹے بڑے کاروباری ہمارے پاس آتے رہتے ہیں اور آپ اتنے برس گزر گئے لیکن......'

'انکل......! پاپا آپ کو نہ صرف آئیڈیل مانتے ہیں، بلکہ انہوں نے تو گھر میں آپ کی

بڑی سی تصویر بھی لگا رکھی ہے۔' سیما بولنے لگی تو مجھے راحت کا احساس ہوا۔

'ہوں...... ! یو آر ویری انٹلی جنٹ ! کہاں پڑھتی ہو؟'

'جی سنٹرل کالج میں بی اے فائنل کی اسٹوڈنٹ ہوں......'

'پڑھنے میں بہت تیز ہے سر...... گاتی بھی بہت اچھا ہے......'

ماتھر صاحب کے لبوں پر ایک بار پھر مسکراہٹ بکھر گئی۔ 'یقیناً اس کی آواز بھی اچھی ہوگی اور تلفظ بھی، میں نے گفتگو سے اندازہ لگالیا اسے تو کسی آرٹسٹ کے گھر میں جنم لینا چاہئے تھا۔ یہ ہم جیسے کاروباری لوگوں کے یہاں......'

پھر ماتھر صاحب ہمیں اپنی حویلی میں لے گئے۔ وہ دیر تک شراب نوشی میں مصروف رہے اور ہم ان کی ہاں میں ہاں ملانے میں۔

وہ شام اتنی خوبصورت گزری کہ مجھ میں اور اعتماد بھر گیا۔ ماتھر صاحب کے آرٹ سے بے پناہ لگاؤ کے پہلو کو میں نے اچھی طرح بھانپ لیا تھا۔ میں سیما کی مدد سے ماتھر صاحب کو جب بھی کوئی ایسا تحفہ پیش کیا کرتا جس میں کہیں نہ کہیں آرٹ کی جھلک موجود ہو تو انہیں بے حد خوشی ہوتی۔ قربت کے بعد ان کی زندگی کے تاریک پہلو سے ہمیں بہت ہمدردی سی ہونے لگی تھی۔

وہ کبھی کبھی موڈ میں ہوتے تو کہہ دیا کرتے کہ شہر کے پہلے آدمی ہو، جس نے میری ذاتی زندگی کو بھی بہت حد تک جان لیا ہے۔ ہم دیر تک گھریلو باتیں کرتے رہتے تو کبھی کبھی وہ معصوم بچوں کی طرح ہم سے پیش آتے، اکثر انہیں جذباتی دیکھ کر میری آنکھیں بھر آیا کرتیں۔

ایک شام میں ماتھر صاحب کی حویلی میں گیا تو پتہ چلا کہ ابھی کچھ دیر پہلے ڈاکٹر ان کے

چیک اپ کے لئے آیا تھا۔ اچانک طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ شاید کام کا بوجھ زیادہ ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ انہیں دس پندرہ دنوں تک آرام کرنا چاہئے۔ میں دوڑتا ہوا ان کے کمرے میں پہنچا تو وہ ایک کتاب کے مطالعے میں محو تھے اور غزل سرا کی مدھم سی آواز بھی ان کے کمرے میں گونج رہی تھی۔

'سر ابھی ابھی پتہ چلا کہ ڈاکٹر آپ کے چیک اپ کے بعد ابھی گیا ہے اور اس نے آپ کو دس پندرہ دنوں تک آرام کی ہدایت دی ہے۔'

انہوں نے کتاب کا صفحہ الٹا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے، 'اوہ جیتندر جی ...... ڈاکٹر تو ہمیشہ ہی مجھے ایسی ہدایات دیتے رہتے ہیں۔'

'لیکن سر......'

'میں جانتا ہوں مجھے کچھ نہیں ہوگا...... بہت مضبوط آدمی ہوں۔'

'نہیں سر......! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔ پلیز آپ ڈاکٹر کی بات مان لیں۔'

میں نے خوشامد کے انداز میں کہا۔ پھر ان سے اپنی اپنائیت کے اظہار کے لئے میں نے فوراً اپنے پڑوسی کے گھر فون کرکے ماتھر صاحب کا دل بہلانے کے لئے سیما اور اپنی پتنی کو بلالیا اور ہم ساری رات ان کی تیمارداری کرتے رہے۔

'انکل ......! آپ کو ڈاکٹر نے ہدایت دی ہے تو آپ کو آرام کرنا چاہئے۔ میں آج ہی آپ کے کسی ہل اسٹیشن جانے کے لئے انتظام کرواتی ہوں......'

'نہیں سیما...... یہاں تو تم لوگوں نے بہت اپنے پن کے ساتھ خدمت کی ہے۔ وہاں

جاؤں گا تو ایک دم اکیلا ہو جاؤں گا، نوکروں سے کہاں دیکھ بھال ہو سکے گی۔'

'آپ ہمیں خود سے الگ کیوں سمجھتے ہیں۔ بیٹی سیما آپ کے ساتھ جائے گی۔ یہ آپ کی سیوا کرے گی، اب تو یہ آپ کی بھی بیٹی ہے۔'

'ہاں انکل...... میں آپ کی سیوا کروں گی۔'

'نہیں نہیں تم لوگ یہ سب نہ کرو۔' گویا یہ مسٹر ماتھر کا فیصلہ تھا مگر پھر بھی جب سیما اور میں نے بہت ضد کی تو وہ مان ہی گئے، میں بہت خوش ہوا کہ ماتھر صاحب جیسے سرمایہ دار نے مجھ جیسے معمولی آدمی کو بھی اپنا فیملی ممبر سمجھا۔

دوسری صبح ہم ان دونوں کو جب ایر پورٹ پر سی آف کرنے گئے تو میں نے ماتھر صاحب سے بہت مؤدبانہ لہجے میں ڈرتے ڈرتے کہا۔

'سر...... مجھے ایک بات......'

'ہاں...... ہاں کہئے...... ارے بولئے بھی...... اب آپ ہمارے لئے غیر تھوڑے ہی ہیں۔'

'سر...... پچھلے دنوں آپ کی کمپنی نے جو ٹنڈر مانگا تھا۔ مجھ جیسے معمولی آدمی نے بھی اسے بھر دیا ہے اگر یہ ٹنڈر مجھے مل جائے تو میں اپنے کاروبار کو فروغ دے سکتا ہوں......'

میرے اتنا کہتے ہی ماتھر صاحب کے چہرے پر اچانک تبدیلی آ گئی مگر پھر بھی دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولے۔ 'ہوں...... آپ راتوں رات لکھ پتی بننا چاہتے ہیں۔ لیکن میں آپ کو اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتا۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ کاروبار میں آج تک میں نے سمجھوتہ نہیں کیا ہے مگر...... آپ نراش نہ ہوں، دیکھوں گا کہ کیا ہو سکتا ہے۔'

ایک ہفتے بعد ہی ماتھر صاحب رو بہ صحت ہو کر شہر لوٹ آئے لیکن سیما مضمحل اور بیمار سی رہنے لگی۔

ماتھر صاحب اپنے کاروبار میں مصروف ہو گئے۔ سیما کی خاموشی گہری ہوتی گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے من میں کوئی بات ہے جو وہ ہم سے کہنا چاہتی ہے مگر کہہ نہیں پاتی — پھر ایک رات اس پر پاگل پن کا دورہ پڑا، وہ زور زور سے چلانے لگی۔

'اس ماتھر کے بچّے کو مت چھوڑنا نمی...... اسے جان سے مار دو ڈیڈی...... اس نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا۔'

اس کی حالت دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں پوری تیاری کے ساتھ ماتھر صاحب کی حویلی جا پہنچا۔ میرے اندر جو کچھ ابل رہا تھا اسے ماتھر کا خون ہی شانت کر سکتا تھا۔

میں بغیر اجازت لئے اس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ حسب معمول وہ شراب سے دل بہلا رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور شاید میری کیفیت کو محسوس کر لیا۔ پھر اس نے بہت خلوص کے ساتھ مجھ سے کہا۔

'آیئے...... جیتندر پرساد جی...... بہت بہت مبارک باد...... راتوں رات لکھ پتی بننے کا آپ کا خواب پورا ہو گیا۔ میں نے آپ کا ہی ٹنڈر پاس کیا ہے۔ آپ یہی چاہتے تھے نا......؟

انہوں نے سوال کیا مگر میرے پاس ان کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ■

آشرم

عجیب دنیا ہے ہماری بھی۔ سچائی میں 'اِسکوپ' نہیں تلاش کر پایا تو پھر ہمیں ناکام صحافی ہی سمجھا جاتا ہے۔ میں ایسا کچھ کر بھی نہیں پایا جسے کہنے کے لئے مخصوص مزاج کے پیش نظر کئی سچویشن سے گزرنا پڑے۔ سچائی بھلے کہیں دب جائے لیکن ایک چونکا دینے والی کیفیت ضرور پیدا ہونی چاہئے یہاں۔ اب خبریں بہت دیر تک کیوں نہیں زندہ رہ پاتیں ...... ناشتے کی میز پر ہی انہیں دم توڑتے ہوئے کیوں محسوس کیا جاتا ہے۔ جسے ہم چونکا دینا چاہتے ہیں شاید وہ اس پر ہول منظر سے بخوبی واقف ہو چکا ہے۔ اب ہونے پر اس کا کوئی ردعمل نہیں ہوتا۔ اب کسی روز کچھ نہیں ہونے پر وہ آنے والے کسی بھیانک طوفان کے تصور سے ضرور لرز جاتا ہے۔

اگر شہر کی بھیڑ سے بہت دور نکل آیا ہوں تو ضرور ہی کوئی مقصد رہا ہوگا۔ شاید خبریں۔ لیکن خبریں تو بھیڑ میں ہی سر اٹھاتی ہیں۔ تاحد نظر ہرے بھرے کھیتوں کا سلسلہ ہے۔ یہاں کائنات بھی وجد میں ہی لگتی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ دھڑکنیں اس فضا میں پوری پاکیزگی، احترام کے ساتھ جینا چاہتی ہیں۔ کہیں کوئی ہم سفر نہیں پھر بھی لگتا ہے کہ ہر لمحہ میرے احساس کی انگلیوں کو تھام کر جینا چاہتا ہے۔ جب میرے تنہا کمرے نے مجھے رخصت کیا تو پھر ایسا ہی لگا تھا کہ میں خبریں لے کر دو چار دنوں میں لوٹ آؤں گا لیکن یہاں پہنچ کر نہیں کہہ سکتا کہ میں لوٹ بھی سکوں گا یا نہیں۔

کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں سے گزرنے کے بعد میں تھک کر ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ جاتا ہوں۔ پاس ہی میں شفاف پانی زمین سے پھوٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے میں اپنی پیاس بجھانا چاہ رہا تھا کہ دور سے آتے ہوئے ڈھیر سارے بچوں کو دیکھا۔ میں رک گیا۔ بچے شاید اسی چشمے کی طرف آرہے تھے۔ اڑتی ہوئی دھول میں سب کچھ واضح نہیں تھا۔ ہاں ان کی کلکاریوں سے موسیقیت ضرور پیدا ہورہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بچے بالکل قریب آگئے۔ میں انہیں حیرت سے دیکھتا رہ جاتا ہوں...... اس خوبصورت کائنات میں اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا میں نے ...... سبھی بچے اپاہج تھے۔ کسی کے پاؤں نہیں تو کوئی دونوں ہاتھوں سے معذور۔ کسی کے پاس بیساکھی ہے تو کوئی زمین پر گھسٹ رہا ہے۔ کسی کا ہاتھ ہی اس کے لئے پاؤں بھی ہے۔ گرد میں اٹے ہوئے بچے۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس۔ غریب اور مفلوک الحال لیکن آنکھوں میں بلا کی چمک۔ چہرے سے بہت آسودہ۔ اپنی کائنات سے مطمئن بچے۔ میں سمجھ نہیں پارہا تھا کہ تخلیق کو اس روپ میں کیوں یہاں بھیجا گیا ہے۔ ان کے اجداد کے گناہوں کی سزا بچے کیوں جھیل رہے ہیں۔ اپاہج اور معذور بچے کس طرح آئے ہیں یہاں۔ انہیں زندہ رہنا ہے اور یہ زندہ رہنا بھی چاہتے ہیں۔

بچے لوٹ جاتے ہیں۔ میں انہیں دور تک جاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ پھر کچھ سوچ کر ان کے پیچھے ہولیتا ہوں۔ بچے ایک آشرم میں داخل ہوتے ہیں۔ اس جھونپڑی نما آشرم کے اطراف دور دور تک ننھے ننھے پودوں کی نرسری ہے۔ اس میں ایک بوڑھا شخص پتوں پر جمی گرد کو صاف کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ میں اس شخص کے ایک دم قریب پہنچ جاتا ہوں۔ وہ مجھے دیکھ کر کھِل اٹھتا ہے۔

'کہاں سے آئے ہو بابو؟'

'میں ایک جرنلسٹ ہوں۔'

'اچھا...... اچھا...... کچھ لکھنا چاہتے ہو۔ پہلے بھی کئی لوگ یہاں آ چکے ہیں۔ سبھوں کو لگتا ہے کہ اس دور دراز علاقے میں بھلا ایسا آشرم بنانے کی کیا ضرورت تھی اور وہ بھی ایک دم غریب اور اپاہج بچوں کی پرورش کے لئے...... اچھا باتیں تو ہوں گی۔ پہلے تم اندر جا کر آرام کر لو۔'

بوڑھا شخص یعنی وہاں کے اجو بابا ایک بچے کو آواز دیتے ہیں۔ بچہ بیساکھی کے سہارے تیزی سے میرے پاس آتا ہے اور مجھے آشرم کے اندر لے جاتا ہے۔ وہاں بچوں کو ایک ماسٹر جی پڑھانے میں لگے تھے۔ ہر بچہ مستحکم ارادے کے ساتھ محو مطالعہ تھا۔ پھر پاس میں ہی ایک بوڑھی عورت پاؤں سے بچوں کو لکھنا سکھا رہی تھی۔

ماسٹر جی کو جب فرصت ملی تو انہوں نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ پندرہ برس پہلے اجو بابا اور ان کی بیوی سکینہ نے اپنے حصے کی زمین پر کچھ بچوں کی پرورش کے مقصد سے ایک آشرم بنایا۔ اجو بابا اور بی سکینہ کی اس کوشش کو پہلے تو ایک دم پاگل پن ہی کہا گیا۔ اگر صحت مند یتیم اور نادار بچے ہوتے تب تو شاید لوگوں کے بیچ ان کو مضحکہ خیز نہیں سمجھا جاتا لیکن انہوں نے اپاہج اور وہ بھی غریب بچوں کی پرورش کا ذمہ لے لیا۔ کسی سے ایک روپیہ بھی نہیں لیا۔ لوگ بچے کو یہاں چھوڑ کر چلے جاتے اور پھر یہ دونوں انہیں جان سے زیادہ عزیز سمجھ کر پرورش کرتے ہیں۔ مختلف تنظیموں سے انہیں تعاون کا وعدہ ضرور ملتا لیکن عام طور پر کوئی بھی ان کی مدد فعال ڈھنگ سے نہیں کرتا۔ جب معذور بچوں کی تعداد اس آشرم میں بڑھنے لگی تو اجو بابا اور بی سکینہ کے سامنے محدود آمدنی کی وجہ سے ان کی پرورش کا مسئلہ درپیش آنے لگا۔ دونوں اور بھی محنت کرنے لگے لیکن اپنے آشرم میں آئے ہوئے کسی بھی اپاہج بچے کی پرورش سے انکار نہیں کیا۔ انہیں یقین تھا کہ اللہ نے انہیں بھیجا ہے تو کوئی انتظام بھی کر دے گا۔ نرسری میں اُگائے گئے صحت مند پودوں کے بیچنے سے جو آمدنی ہوتی ہے اسے اجو بابا اور بی سکینہ اس آشرم میں لگا دیتے ہیں۔ دھیرے

دھیرے گاؤں والوں کو ان کے جنون سے ہمدردی ہونے لگی۔ ماسٹر جی نے مزید کہا کہ میں تو یہاں بس یوں ہی ایک بار ان بچوں کو دیکھنے آ گیا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ اجو بابا اور بی سکینہ نے اپنے لئے جینے کا جو مقصد بنالیا ہے کاش اس میں مجھے بھی شامل ہونے کا موقع مل جائے۔ اور آج برسوں گذر گئے ہیں میں ان بچوں کو پڑھاتا ہوں۔ لگتا ہے عبادت کررہا ہوں۔ اس گاؤں میں ایک آدی واسی مزدور بھی یہاں آیا تھا، اسے بھی ان بچوں سے ہمدردی ہوئی اور وہ اسی جگہ باورچی بن کر رہ گیا۔ اس آشرم میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی بچہ بھوکا رہ گیا ہو۔ کبھی کبھی پودے کم بکے تو بی سکینہ نے اپنے زیورات تک بیچے ہیں ان بچوں کی پرورش کے لئے۔

وہ گاؤں اور خصوصی طور پر اجو بابا کے آشرم نے مجھے کئی دنوں تک وہاں روکے رکھا۔ اجو بابا فرصت کے لمحے میں مجھے فرداً فرداً ہر بچے کے بارے میں بتایا کرتے تھے۔ میرا وہاں رہنا انہیں بہت اچھا لگتا تھا۔ میں ان سے اب سوال نہیں کیا کرتا بس سب کچھ پڑھنے کی کوشش کرتا۔ میں بھول گیا کہ یہاں کس مقصد کے تحت آیا تھا۔ بچوں میں گھل مل گیا اور کوشش تھی کہ جب تک رہوں بچوں کو تعلیم بھی دیتا رہوں۔ میری اس بات سے اجو بابا بہت خوش تھے۔

اسی دوران ملک میں کیا کچھ نہیں ہوا۔ کرفیو، جلوس، نعرے عبادت گاہوں کی بے حرمتی، معصوم بچوں کا قتل...... لیکن اجو بابا کے آشرم میں بھلے ہی اپاہج بچوں کا ہجوم تھا۔ ان کے پاؤں وقت کی تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دے پارہے تھے۔ چاند ستاروں کو چھونے کے لئے جسم پر نہیں اُگے تھے ان کے ہاتھ، لیکن دل کی دھڑکنوں میں بس یہی دُھن تھی کہ ننھا رام دین دکھی تو نہیں، سراج بھوکا تو نہیں سوگیا، سائمن آج بھی اداس تو نہیں...... رات گئے تک اجو بابا کی سنائی ہوئی کہانیوں میں آشرم کا ہر بچہ اپنے آپ کو جیتا ہوا محسوس کرتا تھا۔ اجو بابا اور بی سکینہ کی اولادیں رام دین، سراج، سائمن، ہریا، موتی، احمد، مرانڈی سبھی گہری نیند میں ہوا کرتے تو دونوں دیر تک انہیں ضرور دیکھتے رہتے۔ اکثر بچہ نیند میں سسکنے لگتا تو بی سکینہ اسے کلیجے سے لگالیتیں۔

لیکن نیند میں سسکنے والا بچہ کون ہے؟ وہ رام دین ہے۔ اب تک وہ سات سال کا ہو چکا ہے۔ صرف دو سال کی عمر میں اس کے والدین اسے یہاں چھوڑ گئے تھے۔ ننھے رام دین کو پیار سے اجو بابا نے چھوٹے بابا بھی کہنا شروع کیا تھا۔ اب تو لوگ اس کا اصل نام بھول ہی گئے ہیں۔ اسے چھوٹے بابا کے نام سے ہی جانا جاتا ہے۔ ایک پاؤں اور ایک ہاتھ کے سہارے وہ بہت کچھ کرلیا کرتا ہے بلکہ چھوٹے بابا، دوسرے ساتھیوں کو بھی احساس نہیں ہونے دیتا کہ وہ اپنے آپ کو مجبور سمجھیں۔ چھوٹے بابا صرف اپنے دل سے بہت مجبور ہیں۔ انہیں یاد ہے کہ ان کے پتا جی تین سال پہلے تک کبھی کبھی انہیں پوچھنے ضرور آجایا کرتے تھے۔ ماں بھی ساتھ میں آیا کرتی تھیں لیکن پتہ نہیں کیا ہوا کہ تین چار برسوں سے کوئی اس کی خبر لینے کو نہیں آتا۔ چھوٹے بابا نے جب اجو بابا کے سامنے یہ مسئلہ رکھا تو ان کا جواب ہوتا کہ جب ہم تمہارے بابا ہیں تو پھر کسی کی کیا ضرورت ہے۔ چھوٹے بابا کو اگر دو سال کی عمر میں ان کے والدین یہاں چھوڑ کر چلے جاتے اور پھر کبھی نہیں لوٹتے تو شاید وہ نیند میں نہیں سسک رہا ہوتا۔ اکثر والدین اپنے بچوں کو آشرم میں دیکھنے کے لئے آجاتے ان کے ساتھ کھیلتے انہیں اپنے ہاتھوں سے کھلاتے اور پھر چلے جاتے۔ چھوٹے بابا ایک کونے میں بیٹھ کر یہ سب دیکھتے رہتے۔ ایسے میں سکینہ ان کو بہلانے کے لئے نرسری میں لے جاتیں اور وہ وہاں بہل بھی جاتا۔ لیکن پھر بھی دل سے مجبور ہیں چھوٹے بابا۔

نیند میں سسکنے والے بچے رام دین عرف چھوٹے بابا میں جب بی سکینہ اور اجو بابا نے میری خصوصی دلچسپی دیکھی تو پتہ نہیں کیوں انہیں دلی خوشی ہوئی۔ ایسا لگا جیسے اچانک کوئی ان کا غم بانٹنے آگیا ہو۔ میں نے محسوس کرلیا تھا کہ اس آشرم میں ہر قدم پر کہانیاں بکھری پڑی ہیں بس انہیں اپنے اندر سمیٹنے کی ضرورت تھی...... جن کے اعضاء نہیں کام آسکتے پتھر کاٹنے میں، جو ڈھو نہیں سکتے مرے ہوئے انسان کا بوجھ، جو تمہاری طرح نہیں شامل ہوسکتا دوڑ میں جہاں جیتنے والے کم اور ہارنے والے زیادہ ہوا کرتے ہیں۔ وہ صرف آباد کرسکتا ہے اپنے دل کی بستی کو جہاں بہ ظاہر صحت مند نظر

آنے والے لوگ جانہیں پاتے۔ تمہاری رچنا کو ایک آکار دینے کے لئے ہی جنم لیا ہے بی سکینہ اور اجو بابا نے۔ تم نے اپنی اصل سوچ کا ساکار روپ دیکھا تو اسے چھوڑ گئے اجو بابا اور بی سکینہ کے آشرم میں۔ ان دونوں نے ہر کرب کو جھیل لیا ہے لیکن وہ نیند میں سسکنے والے رام دین عرف چھوٹے بابا کے ننھے سے دل کا کیا کریں۔ وہ کب تک اس معصوم کو بہلائیں۔ ان ہی الجھنوں نے مجھے ان دونوں کے درمیان لاکر کھڑا کر دیا۔ اجو بابا نے ایک روز مجھ سے کہا۔

'بیٹا...... یوں تو مجھے سبھی بچے جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ لیکن رام دین میں پتہ نہیں کیا بات ہے کہ میں بہت دیر تک اس کے سامنے خود کو روک نہیں پاتا۔ میں تو خود بھی چھلک پڑتا ہوں۔ اس آشرم میں سبھی بچے غریبوں کے پریوار سے آئے ہیں۔ ایسے پریوار سے جنہیں دو جون کی روٹی بھی میسر نہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ یہاں ان کے بچوں کو کھانا مل جائے گا۔ تھوڑا بہت پڑھ بھی لیں گے ساتھ ہی انہیں کچھ ایسا کام سکھا دیتا ہوں کہ ایمانداری سے بڑے ہو کر اپنی زندگی گزار سکیں۔ کوئی کوئی پریوار تو ایسا بھی ہے جو ایک بار اپنے بچے کو یہاں چھوڑ گیا تو پھر کبھی نہیں آیا۔ میں بھی انہیں اللہ کی امانت سمجھ کر پالتا ہوں۔ رام دین کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ صرف دو سال کی عمر میں اس کے باپ نے اسے یہاں لاکر چھوڑا تھا۔ کچھ روز تک دونوں آتے رہے۔ پہلے ماں نے آنا کم کر دیا۔ پھر باپ بھی نہیں آنے لگا۔ پتہ چلا کہ رام دین کے گھر ایک نئے بھائی کا جنم ہو چکا ہے۔ وہ بچہ ہر اعتبار سے صحت مند تھا۔ رام دین کے والدین کا وقت اب اسی بچے کے ساتھ زیادہ گزرا کرتا تھا۔ وہ ایک پریشان خواب کی طرح اپنے اپاہج بچے کو بھول جانا چاہتے تھے۔ جب میں نے رام دین کے باپ سے ملاقات کی تو اس نے بہت سردمہری سے کام لیا۔ آشرم میں آنے کا وعدہ تو کیا لیکن دونوں میں کوئی نہیں آیا۔ میں اور بی سکینہ رام دین کو بہلاتے رہے لیکن اس کے ننھے سے دل کو بدلنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

جب اجو بابا مجھے رام دین عرف چھوٹے بابا کے بارے میں بتا رہے تھے تو سکینہ کے

آنچل میں چھپ کر بہ ظاہر سوتا ہوا نظر آنے والا رام دین بغیر بیساکھی کے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور پھر تیزی سے کمرے میں رکھے ہوئے اپنے ٹوٹے پھوٹے بکسے سے اپنے باپ کے دیئے ہوئے کھلونوں کو نکالا اور پھر پاس میں پڑی ہوئی بیساکھی سے سب کو چور چور کر ڈالا۔ بی سکینہ نے اسے ایسا کرنے سے روکنا چاہا تو اجو بابا نے منع کر دیا۔ پھر رام دین دیوار کی اوٹ میں جا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بی سکینہ نے چاہا کہ اسے گلے سے لگا لیں لیکن اس لمحے میں بھی اجو بابا نے اس کے پاس نہیں جانے دیا۔ کچھ دیر بعد خود ہی رام دین بی سکینہ کے پاس آیا اور ان سے لپٹ کر رونے لگا تو اجو بابا کی آنکھیں بھی خود کو نہیں روک سکیں۔ بی سکینہ تو پھوٹ ہی پڑیں۔

شاید یہ اچھا ہی ہوا تھا نیند میں سسکنے والے اس بچے کے ساتھ۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ بی سکینہ ننھے رام دین عرف چھوٹے بابا کو اپنے آنچل میں چھپا کر سو رہی ہیں۔ اجو بابا پاس ہی میں کھڑے انہیں بہت غور سے دیکھ رہے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ بچہ سکون کے ساتھ سو رہا ہے۔ لیکن بی سکینہ نیند میں سسکنے لگی ہیں۔

اجو بابا ڈیوڑھی میں بیٹھ کر صبح کا انتظار کر رہے ہیں۔ انہیں امید ہے کہ کسی بھی وقت کوئی آسمانی پیغام ان کے پاس آئے گا اور وہ حکم کے مطابق اپنی بنائی ہوئی اس کائنات کو کسی اور اجو بابا کو سونپ دیں گے۔ ڈیوڑھی کے پاس ہی کھڑا ہو کر میں سوچ رہا ہوں کہ ابھی خبریں تو بہت ہیں میرے پاس۔ لیکن کچھ بھی 'اِسکوپ' نہیں بن سکتا۔ اگر اس مقدس جگہ کو کہیں بھی میں نے کسی خاص سچویشن کے لئے کریدنے کی کوشش کی تو انرتھ ہو جائے گا۔ یہاں میں اپنی زندگی اپنی تنہائی کو جینے کا مقصد دینا چاہتا ہوں۔ شاید اسی لئے میں نے اجو بابا سے کہا کہ وہ اب سو جائیں۔ مجھے اس رات کے بارے میں بہت کچھ سوچنا ہے۔ میں دھیرے دھیرے اجو بابا میں ضم ہوتا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد محسوس کیا کہ ڈیوڑھی میں ان کی جگہ بیٹھ کر تنہا آشرم کے آس پاس اُگتے ہوئے ننھے پودوں کی رکھوالی کر رہا ہوں۔ ■

کیل

سمندر کے کنارے بسے ہوئے اس شہر میں بہتوں کی طرح دفتر میں دن بھر کلرکی کرنے کے بعد میں کبھی اس مقام پر جایا کرتا تھا جہاں دور تک ریت پر بکھرے ہوئے لوگ ہوا کرتے تھے۔ میں سمندر کی لہروں کو ٹوٹتے بکھرتے دیکھتا اور پھر دفتر کی بہت ساری باتیں یاد آنے لگتیں۔ صاحب ٹھیک گیارہ بجے دفتر پہنچتے تھے۔ حاضری کا رجسٹر طلب کرتے۔ اس وقت تک جو بھی دفتر نہیں پہنچ پاتا، اس کے نام کے آگے کراس لگا دیتے۔ کئی بار میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ دفتر میں ڈسپلن قائم رکھنے کے لئے یہ بھی ضروری تھا۔ ہم سب صاحب کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ شاید اس لئے بھی کہ انہوں نے مجھ جیسے کئی کلرکوں کو ڈسچارج بھی کیا تھا۔ اپنے نرم رویئے کی وجہ سے میں کئی بار بال بال بچا بھی تھا۔ اگر ان کی کوئی بات کھلتی بھی تو میں اسے سمندر کی لہروں میں دفن کر دینے کے بعد ہی گھر لوٹتا۔ گھر میں تین جوان بیٹیاں اور پھر میری پتنی۔ تینوں بیٹیاں شہر کے ایک معمولی کالج میں پڑھا کرتی تھیں۔ حالانکہ میرے لئے ان کی تعلیم جاری رکھنا آسان نہ تھا پھر بھی ان کی خواہشوں کو مجروح کرنا نہیں چاہتا تھا۔ شاید اسی لئے ان کی تعلیم کا بوجھ ڈھو رہا تھا۔ میں نے صاحب کو خوش رکھنے کے لئے گھریلو تعلقات بھی بڑھائے۔ شاید اسی لئے اپنی بیٹیوں اور پتنی کو ان کے گھر ضرور بھیجا کرتا۔ صاحب اسی گھنی آبادی والے شہر میں بھی اپنی پہچان دولت کے بل بوتے پر بنا چکے تھے۔ شہر کے چند رئیسوں میں ان کا شمار ضرور ہوا کرتا۔ میری پتنی صاحب کے بیٹوں کے لئے ان کی پسند کا حلوہ بنا کر اکثر لے جایا کرتی۔

سب اس کی بہت تعریف کیا کرتے۔ شاید اسی لئے صاحب میری بہت ساری کمزوریوں پر بھی دھیان نہیں دیتے تھے۔ دفتر کے دوسرے کلرک مجھ پر فقرے کستے تو میں برداشت کرلیا کرتا۔ کبھی کبھی صاحب تک یہ خبر پہنچا دیتا۔ پھر ڈھیر سارے تلخ تجربے ہوئے اور میں نے یہ عادت تقریباً ترک کردی۔

آج جب گھر پہنچا تو پتہ چلا کہ ہماری چھوٹی بیٹی رادھا کالج کے بعد سیدھے صاحب کے گھر چلی گئی۔ صاحب کی لڑکی ہم عمر ہونے کی وجہ کر رادھا کو بہت چاہتی تھی۔ وہ اکثر رات میں بھی اسے روک لیا کرتی تھی۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی بلکہ میرا سر فخر سے کسی حد تک اونچا بھی ہوا۔ ٹھیک اسی وقت میں نے ایک اہم فیصلہ بھی کیا تھا۔ من ہی من خود کو خوش نصیب تصور کرتا رہا۔

رات کے لگ بھگ گیارہ بجے صاحب کا نوکر بہت پریشانی کے عالم میں میرے گھر پہنچا۔ اور اس نے بتایا کہ بڑے لڑکے چندر بابو کے ساتھ رادھا بٹیا کہیں بھاگ گئی ہیں۔ صاحب کے نام چندر بابو نے خط چھوڑا ہے۔ وہ بہت غصے میں ہیں۔ آپ دونوں کو تلاش کیجئے نہیں تو انرتھ ہوجائے گا۔

پل بھر کے لئے میں سناٹے میں آگیا۔ میرے گھر کے سارے لوگ سہم گئے اور اسی حالت میں دونوں کو تلاش کرنے کے لئے اسٹیشن کی طرف بھاگا۔ جہاں تک ممکن ہوسکا انہیں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اتنے بڑے شہر میں کہاں کہاں ڈھونڈتا۔ ہر شخص سے یہ بات کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اور پھر اس اندھیری رات میں لوٹتے ہوئے میرے جوتے میں کوئی کیل بہت بے دردی سے چبھتی گئی۔ تلوے سے خون رِسنے لگا۔ میں اس کیل کو نکالنے کی بہت کوشش کی لیکن مکمل طور پر کامیاب نہ ہوسکا۔

دفتر میں سیاست کا بازار گرم ہو چکا تھا۔ سب کی نگاہ کا مرکز میں ہی تھا۔ کچھ لوگ مجھ

سے ہمدردی ظاہر کرتے اور میں انہیں اپنے دل کی ساری باتیں بتادیتا۔ دوسرے دن ہوٹل کی میز پر قہقہوں کے بیچ میری مجبوریاں موضوع بحث ہوا کرتیں۔ صاحب سات دنوں سے دفتر نہیں آرہے تھے۔ ہاں ان کے آدمی ہر چار گھنٹے بعد میرے گھر پہنچتے اور بہت کچھ کہہ کر چلے جاتے۔ ہم سبھوں کو ان کی باتیں برداشت کرنی پڑتیں۔ پھر میرے گھر کا ماحول کرفیوزدہ ہوگیا۔ جہاں صاحب کے گھر سے کوئی گاڑی آتی سبھی ایک جگہ جمع ہوجاتے۔ اور پھر ہم سبھوں میں سرگوشیاں ہونے لگتیں۔ پھر کئی دنوں تک اُن دونوں کو تلاش کرنے میں ناکام رہے تو صاحب نے مجھے اپنے گھر بلایا۔ میں سہما سہما ان کے سامنے گیا وہ بہت دیر تک مجھے گھورتے رہے۔ میں نے اپنا سر جھکا لیا۔ پہلے تو انہوں نے مجھے کئی بھاری بھرکم گالیاں دیں اور پھر چیخ کر کہنے لگے۔

'اگر کل تک چندر نہیں لوٹا تو میں تمہاری اس جوان لونڈیا کا کیا حشر کروں گا تم سوچ بھی نہیں سکتے۔'

'لیکن سر۔'

'میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ تم لوگوں کی سازش ہے۔ کافی اچھا دھندہ ہے یہ، لیکن تم کامیاب نہیں ہوسکتے۔'

'سر میری بات۔'

'شٹ اپ۔ تم یہاں سے جاسکتے ہو۔'

میں نے صاحب کو بہت سمجھانا چاہا لیکن نوکری آڑے آجاتی۔ تب مجھے ناکام ہی لوٹنا پڑا۔ سڑک پر چلتے ہوئے پھر مجھے کیل چبھنے لگی۔ لیکن اب کہیں سے خون نہیں رِس تھا۔ جوتے کے ہر حصے کو دیکھا کہیں کوئی کیل نہیں تھی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں......؟ چند لمحے بعد دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ اس تکلیف سے نجات حاصل کرنے کے لئے مجھے یہ جوتے بدل دینے کی ضرورت ہے پھر معاشی بدحالی سامنے کھڑی ہوتی یا دوسری طرف میرا وجود سورج کی تپش سے

جھلسی ہوئی زمین پر پگھلتے ہوئے دکھائی دینے لگتا اور پھر میری چیخ و پکار سننے کے لئے کوئی بھی قوت سماعت پر زور دینا نہیں چاہتا۔ میں نے اس کیل کو چبھنے دیا جسے میں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد دھرتی پر بچھائے ہوئے کانٹوں سے گزرتا ہوا کسی طرح اپنے گھر پہنچا۔

دس دنوں بعد دونوں کو شہر کے ہی ایک ہوٹل سے برآمد کیا گیا۔ رادھا کے گھر پہنچتے ہی میں نے اپنے جوتے سے اسے پیٹ پیٹ کر لہولہان کر دیا۔ تین دنوں تک وہ گھر کے ایک گوشے میں پڑی رہی کسی کو اس سے کچھ پوچھنے کی اجازت نہیں دی تھی میں نے۔ اب دفتر پہنچا تو لوگوں کی نگاہیں مجھے شرمندگی کے گہرے سمندر میں بہت دور تک جانے کے لئے مجبور کرتیں۔ سماج کے ہر فرد کے لئے میں دلچسپ کردار ہو گیا تھا۔ دفتر میں فقرے سننا میری عادت سی ہو گئی تھی۔ صاحب اب اس طرح خوش نظر آتے تھے جیسے کبھی کوئی حادثہ رونما نہ ہوا ہو ان کی زندگی میں۔ میرے گھر کے لوگ صاحب کے یہاں جانا نہیں چاہتے تھے اور یہ طے تھا کہ اس طرف بھی ہمارے لئے ان کے گھر کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا تھا۔ مجھے اس بات کا بہت دکھ تھا کہ صاحب نے مجھ سے اپنا ذاتی کام لینا بالکل بند کر دیا تھا۔ اتنے برسوں تک ان کی نگاہ کا مرکز بننے کے بعد اپنے بارے میں بہت کچھ سوچ لیا تھا میں نے۔ میری محنت سے ان کے دل میں بنا ہوا گھر ٹوٹ چکا تھا۔ اب دن بھر دفتر میں جو باتیں ہوا کرتیں۔ میں انہیں سمندر کے کنارے کھڑا ہو کر ڈوبتی ابھرتی لہروں میں دفن بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بہت دیر تک ایک ہی مقام پر کھڑا رہا صرف اس خوف سے کہ راہ طے کرتے وقت کیل پھر بڑی بے دردی سے چبھنے لگی تھی۔

یوں تو گھر کا ماحول کسی حد تک ٹھیک ہو گیا تھا لیکن جب رادھا کو دیکھتا تو میرا جسم کانپ اٹھتا۔ شاید اس لئے بھی کہ پاس ہی میں دو اور جوان بیٹیاں کھڑی ہوتیں۔ میں نے رادھا کے کالج کی پڑھائی چھڑا دی اس نے کوئی بھی مخالفت نہیں کی۔ کچھ دنوں بعد رادھا کو یہ احساس بھی ہو گیا کہ جب وہ میرے سامنے آجاتی تو میری آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ اس کے لئے میرے

ذہن میں بہت گندے خیالات ابھرتے ہیں۔ شاید اسی لئے اس نے میرے سامنے بھی آنا بند کردیا تھا۔ تب مجھے بہت حد تک سکون بھی ملتا تھا۔

تین مہینے بعد چندر کی شادی اس کی مرضی سے ایک سرمایہ دار منسٹر کی بیٹی کے ساتھ ہورہی تھی۔ اس کی شادی میں مجھے چھوڑ کر دفتر کے سبھی لوگ شامل تھے۔ ایک پل کے لئے میرے دل میں احتجاج کی بھاؤنا جگی تو میں پہلے سے زیادہ خوفزدہ ہوگیا۔ جلتے ہوئے سورج کے دائرے میں جاکر اپنا سب کچھ خاک کرنا نہیں چاہتا تھا اور میں نے خود کو محفوظ رکھنے کے لئے خاموش رہنا زیادہ مناسب سمجھا۔ تب رادھا بہت روئی تھی۔ اس پر بے ہوشی بھی طاری ہوئی تھی۔ میں نے اس حالت میں بھی اس سے ہمدردی کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھا بلکہ اپنی دو جوان بیٹیوں کے اچھے کردار کا حوالہ دے کر اسے خوب پیٹا بھی تھا۔ پھر وہ بیمار پڑ گئی۔ میں نے اس کے علاج پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔ میری پتنی اس کے پاس بیٹھ کر ہر وقت روتی رہتی۔ تب مجھے اس سے بھی نفرت ہونے لگی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے رادھا گزر گئی۔ یہ صرف میں جانتا تھا کہ اس نے خودکشی کی تھی۔ لیکن کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا...... میری نوکری؟ دو جوان بیٹیاں اور پتنی؟ ایک زندگی پر اتنی ساری زندگیاں قربان کروں؟ بالکل نہیں۔ ہاں اس روز تنہائی میں صاحب کو خوب گالیاں دیں۔ یہ بھی جی چاہا کہ چندر کا گلا گھونٹ دوں جاکر...... اور جب میری بیٹی کا بھی کردار سامنے آجاتا تو میں صدائے احتجاج کو مصلحت کی زبان دینے کی کوشش کرنے لگتا۔ آج دفتر گیا تو صاحب نے کئی مہینے بعد مجھے اپنے چیمبر میں بلایا۔ ہمدردی کا اظہار کیا۔ میری آنکھیں بھر آئیں۔

دوسرے دن اچانک صاحب نے مجھے پروموشن دے دیا۔ میں فرطِ مسرت سے جھوم اٹھا۔ جذباتی ہوکر ان کے پیروں کو چھوا۔ اور دیر تک شکریہ ادا کرتا رہا۔ پھر دفتر کی ڈسپلن کو بھول کر اس پروموشن لیٹر کے ساتھ لپکتا ہوا اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ ہماری برسوں کی محنت کام آگئی تھی۔ آج میں سمندر کے کنارے ٹھہرنا بھی نہیں چاہتا تھا شاید اس لئے بھی کہ راہیں طے کرنے پر وہ کیل نہیں چبھ رہی تھی جس نے کل تک مجھے ہر قدم پر روکا تھا۔ ■

پوسٹر

وہ جاڑے کی کانپتی ہوئی بے پناہ سرد رات تھی۔ میرا چھوٹا سا شہر مکمل طور پر گھنے کہرے میں ڈوب چکا تھا۔ ہم تین افراد اپنے اپنے جسم کو گرم کپڑوں سے ڈھک کر شہر کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے آس پاس کی دیواروں کو دیکھ رہے تھے۔ جہاں کوئی مناسب جگہ نظر آتی پوسٹر چپکانے کے لئے وہاں تک پہنچ جاتے۔ پوسٹر چپکانے کا کام ہمیں رات میں ہی کرنا پڑتا تھا۔

اس چھوٹے سے شہر میں یوں تو ڈراموں کا کوئی خاص اسکوپ نہ تھا، لیکن ایسا کرنے سے ہم سبھوں کی پہچان ضرور بنی تھی۔ ڈرامے سے دلچسپی کی اور بھی کئی وجہیں تھیں جیسے فلم یا ٹیلی ویژن کا خواب...... عام لوگوں کے دلوں میں ہمدردی کا جذبہ...... تنظیم کی طرف سے بڑے بڑے شہروں اور بیرون ممالک کی سیر...... خوبصورت کیریر...... دانشوروں میں شمولیت...... یہ سب ہم لوگ انقلاب یا کرانتی کے نام پر آسانی سے کر لیتے تھے۔

اس رات کئی مقامات پر پوسٹر چپکانے کے بعد ہم سب رات کے لگ بھگ دو بجے ریلوے پلیٹ فارم کے پاس پہنچے۔ کہرا کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔ لیکن رات اور بھی سرد ہو چکی تھی۔ کتے لگاتار بھونک رہے تھے۔ پھر ہم نے دیکھا کہ ریلوے لائن کے پاس ہی ایک پیڑ کے نیچے کچھ لوگ الاؤ کے چاروں طرف بیٹھے آگ اپنی ہتھیلیوں میں جذب کر رہے تھے۔ میرا ایک دوست جو سردی سے بہت کانپ رہا تھا، الاؤ کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اس جگہ کئی مزدور بھی بیٹھے

ہوئے تھے۔ ہمیں اور بھی کئی جگہوں پر جانا تھا، اس لئے میں نے اپنے ہاتھ میں لیئی کا بڑا سا ڈبہ اٹھایا اور اپنے دوسرے دوست کو پوسٹر دیتے ہوئے بولا کہ اس بیچ ہم دونوں پلیٹ فارم والا کام پورا کرلیں۔ یہی طے پایا اور پہلے پاس میں پڑی ہوئی ایک ٹوٹی پھوٹی پرانی بوگی پر پوسٹر چپکایا اور پلیٹ فارم کی طرف بڑھنے لگا۔

پلیٹ فارم بہت بڑا تو نہیں تھا پھر بھی فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم کا انتظام تھا۔ فرسٹ کلاس ویٹنگ روم کے دروازے پر دربان ہوا کرتا تھا جو ساری رات سوتا رہتا، اس روز بھی وہ اپنے کمبل میں لپٹا ہوا غالباً سو چکا تھا۔ پلیٹ فارم پر کہیں ٹیوب لائٹ کی روشنی تیز تھی کہیں مدھم اور کہیں اندھیرا بھی تھا...... کچھ لوگ دن بھر کام کرنے کے بعد معمول کے مطابق چھت کے نیچے سوتے ہوئے نظر آئے۔ ان کے لئے موسم کی قید نہ تھی...... پلیٹ فارم کے تاریک حصے میں ہم دونوں ٹارچ کی مدد سے پوسٹر چپکانے لگے تو اسی وقت ایک خارش زدہ کتا لیئی کے ڈبے کی طرف بڑھا تو میں نے جوتے سے اس پر وار کیا اور وہ اندھیرے میں گُم ہوگیا۔ کچھ مخصوص جگہوں پر ہی ہمیں پوسٹر چپکانے کی اجازت تھی۔ اس لئے ان جگہوں پر خاص نگاہ تھی۔ پلیٹ فارم کے تاریک حصوں میں کئی پوسٹرس لگانے کے بعد میرے دوسرے دوست کو بھی شدید ٹھنڈک کا احساس ہوا جبکہ ان کے جسم پر بھی اوور کوٹ...... سوئیٹر...... گرم کوٹ...... اونی شال، سب کچھ تھا۔ اس نے مجھے بھی کچھ دیر کے لئے الاؤ کی طرف چلنے کو کہا۔ میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی اور تنہا پوسٹر پر لیئی لگاتا رہا اور اسے جگہ جگہ چپکاتا بھی رہا۔ میرا دوسرا دوست بھی الاؤ کے پاس بیٹھ چکا تھا۔ تنہا ہونے سے مجھے پوسٹر لگانے میں دیر ہوجاتی اور اسی دوران جب میں پاس والی دیوار پر پوسٹر لگا کر لوٹا تو لیئی کا ڈبہ غائب تھا...... ٹارچ کی روشنی میں اِدھر اُدھر دیکھا کہیں ڈبہ نظر نہیں آیا تو میں نے سوچا ممکن ہے دوستوں نے جان بوجھ کر پریشان کرنے کے لئے غائب کردیا ہو لیکن دور الاؤ کے پاس انہیں بیٹھے ہوئے دیکھا تو یقین ہوگیا کہ

لیئ کا ڈبہ یہاں سے کوئی اور اٹھا کر لے گیا ہوگا۔ میں ٹارچ کی روشنی میں پلیٹ فارم کے تاریک حصے میں ڈبہ تلاش کرنے لگا۔ جس خارش زدہ کتے کو کچھ دیر پہلے ہم نے اس جگہ دیکھا تھا اچانک پھر اس پر نظر پڑی، وہ ایک سرد چولہے کے اندر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اپنے جوتے سے ٹھوکر دے کر اسے باہر نکالا لیکن اس جگہ بھی لیئ کا ڈبہ موجود نہیں تھا۔ تب مجھے تشویش ہوئی۔ پلیٹ فارم کے روشن حصے میں بڑھا...... اس جگہ بھی ناکامی ہوئی۔ تب اندھیرے میں پڑے ہوئے بقیہ پوسٹرس کو اٹھانے کے لئے پہنچا ہی تھا کہ ٹارچ کی روشنی ایک گوشے میں پھیل گئی۔ اس جگہ ایک بہت نحیف سا بچہ جس کی عمر لگ بھگ سات سال رہی ہوگی جسم پر کوئی کپڑا نہیں ...... سیاہ رنگت...... وہ بری طرح کانپ رہا تھا اور لیئ کا ڈبہ اس کے ہاتھ میں تھا...... وہ مجھے دیکھ کر بالکل سہم گیا۔ ٹارچ کی روشنی اس بچے کے اور قریب پہنچتی گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ ڈبے کے اندر تھے۔ میں بالکل خاموش رہا۔ وہ کسی بھی حال میں ڈبہ مجھے واپس کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تب ٹارچ کا رُخ دوسری طرف موڑ کر دیر تک وہیں کھڑا رہا...... محسوس کیا کہ بچہ تیزی کے ساتھ اس ڈبے سے لیئ نکال کر اپنی بھوک مٹانے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد ساری لیئ وہ اپنے حلق میں اتار چکا تو ٹارچ کی روشنی نے ایک بار پھر اُسے چھونے کی کوشش کی۔ اس بار وہ بہت سہما ہوا نہیں تھا بلکہ ڈبے کے اندرونی حصے میں جمی ہوئی لیئ کو بھی انگلیوں سے نکالنے میں مشغول تھا لیکن وہ سردی سے بدستور کانپ رہا تھا...... میں نے سوچا کہ اپنی شال اس کے جسم پر ڈال دوں، تب ہی میرے اندر بھی سردی کا احساس اور شدید ہوگیا۔ پھر میں نے اپنی فکر کو مصلحت کی زبان دی اور دھیرے دھیرے وہاں سے بڑھتا ہوا اس جگہ پر آیا جہاں پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ ٹارچ کی روشنی میں اپنے ناٹک کا خوبصورت پوسٹر دیکھا اور من ہی من آرٹسٹ کی تعریف کرنے لگا...... تب ہی...... دھیرے دھیرے فضا میں بوٹوں کی ٹاپ گونجنے لگی۔ ٹاپ میرے لئے نئی نہیں تھی۔ پھر بھی گھنے اندھیرے سے ابھرنے والے اس شخص سے ملنا چاہتا تھا...... آواز قریب آتی گئی...... بوٹوں کی ٹاپ والا آدمی پھر بھی نظر نہیں آیا۔ لیکن پلیٹ فارم پر

خاص تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ خارش زدہ کتا آوٹر سگنل کی طرف بھاگا۔ مسافر سنبھل کر بیٹھ گئے...... ایک بوڑھی عورت پھلوں کی ٹوکری اٹھا کر ریلوے لائن کے اس پار جانے لگی...... چھت کے نیچے غیر قانونی طور پر سوئے ہوئے لوگ جب بھاگنے لگے تو اسی وقت وہ شخص نمودار ہوا۔ بھاگنے والوں کا پیچھا کر کے انہیں گندی گالیوں کے ساتھ پیٹتا رہا...... تھوڑی دیر کے لئے خاموشی کا سہاگ اجڑ گیا۔ بوٹوں کی ٹاپ والے آدمی سے میں اچھی طرح مل چکا تھا کہ اس وقت وہ ڈیوٹی پر کم اور نشے میں زیادہ ہوا کرتا تھا۔ وہ شخص اب تیزی سے میری طرف آرہا تھا...... بالکل قریب پہنچ گیا...... ٹارچ کی روشنی میں میرا چہرہ دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

'کیوں بھیا پھر کوئی نیا ناٹک ہے کیا؟'

'ہاں پرسوں اسٹیج ہونے والا ہے۔ گیٹ پاس آپ کے لئے بھجوادوں گا۔'

'بہت محنت کرتے ہو بھیا...... خود ہی ناٹک کھیلو بھی اور خود ہی پوسٹر بھی لگاؤ۔ بہت لگن سے کام کرتے ہو۔'

'محنت سے ہی سب کچھ ہوتا ہے نا......'

'فلم ولم میں چلے جاؤ تو ہم کو بھی چانس دینا ذرا...... ہے...... ہے...... ہے...... تمہارا دوست لوگ کدھر ہے؟'

'وہ سامنے الاؤ کے پاس۔'

پھر بوٹوں کی ٹاپ والا آدمی اِدھر اُدھر کچھ ڈھونڈتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ تب ہی اس کی نگاہ سردی سے کانپتے ہوئے اس بچے پر پڑی جو کچھ دیر پہلے لیئی سے اپنی بھوک مٹا رہا تھا۔ بچے نے اس کو دیکھا تو وہ اور بھی کانپنے لگا۔ شاید وہ رونا چاہتا تھا...... وہ اس شخص سے بخوبی واقف

ہونے کی وجہ سے زمین پر رینگتے ہوئے بھاگنا چاہتا تھا۔ لیکن بوٹ سے ٹھوکر دینے کے بعد وہ شخص معمول کے مطابق اسے بھاری بھرکم گالیوں کے ساتھ پیٹنے لگا۔ وہ جب بھی اذیت سے نجات حاصل کرنا چاہتا، بوٹ کی ٹھوکر اسے قید کر لیتی۔ بچے کو جب بہت پیٹ دیا گیا تو میں آہستہ آہستہ بوٹوں کی ٹاپ والے آدمی کی طرف بڑھنے لگا۔ سوچا کہ پاس والا پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے ماروں لیکن اس کی کرخت آواز نے مجھے روک دیا۔ وہ بچے پر اور بھی تیزی سے برسنے لگا تھا۔

'آج کے بعد اگر تیرے کو پھر اِدھر دیکھ لیا تو جان نہیں بچے گی...... سالا مسافروں کا مال چرانے کے لئے اِدھر اندھیرے میں بیٹھا رہتا ہے...... لچا کہیں کا...... تب نا یہ حال ہے...... چل بھاگ یہاں سے چور کی اولاد......'

میرے دوسرے دوست الاؤ کے پاس بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ میں بھی اس جگہ پر بیٹھ گیا۔ باقی مزدور شاید سو چکے تھے...... بوٹوں کی ٹاپ والے آدمی کی آواز اب بھی خلاء میں گونج رہی تھی۔ خارش زدہ کتا بہت دور سے ہی اس پر بھونک رہا تھا...... پھر ریلوے لائن سے الگ ٹوٹی پھوٹی اس پرانی بوگی کو میں غور سے دیکھنے لگا جو اس اسٹیشن کی خاص پہچان تھی۔ اسے کبھی انجن کے ساتھ نہیں جوڑا جا سکتا تھا۔ اچانک ہوا کا سرد جھونکا میرے وجود پر حاوی ہو گیا۔ تب الاؤ کو مزید روشن کرتے ہوئے میں سوچنے لگا۔ آج سے لگ بھگ آٹھ سال پہلے بوٹوں کی ٹاپ والے آدمی کو میں نے جانا تھا۔ وہ بھی ایسی ہی سرد رات تھی۔ ہم اس پرانی بوگی پر پوسٹر چپکا رہے تھے۔ اندر سے سرگوشیاں ابھریں۔ دور سے آتی ہوئی روشنی میں انہیں جھانک کر دیکھا۔ بوٹوں کی ٹاپ والے اس آدمی کے ساتھ اور بھی دو اشخاص وہاں موجود تھے۔ دن میں ریلوے لائن کے آس پاس کوئلہ چننے والی ایک جوان عورت ان کی گرفت میں تھی۔ لوگ اپنی اپنی سطح پر اسے نوچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بوٹوں کی ٹاپ والا آدمی عورت سے بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ تمہیں

جتنا کوئلہ چاہئے میں دوں گا...... عورت ان سے خود کو کسی طرح الگ کرنا چاہتی تو پیٹ بھی دی جاتی...... پھر دیر تک اسے منانے کا سلسلہ جاری رہتا اور اکثر وہ خوش بھی ہو جاتی۔ کبھی کبھی ان کی چھیڑ چھاڑ سے دیر تک ہنستی رہتی...... دوسرے دن بازار میں کوئلہ بیچنے سے اس کی خاصی آمدنی ہو جاتی۔ یہ سلسلہ اسی طرح قائم رہا۔ عورت رات کے کسی حصے میں اس بوگی میں جاتی...... پھر کھلکھلانے چیخنے اور سسکنے کی آوازیں ملتیں۔ عورت جب نڈھال اس بوگی سے باہر آتی تو بوٹوں کی ٹاپ والے آدمی کا بھی نشہ اتر چکا ہوتا۔

دو سال پہلے ریلوے لائن پر کوئلہ چننے والی وہ عورت حادثے کا شکار ہوگئی تو دیر تک لاش کے پاس تنہا اس کا ننھا بالک رو رہا تھا۔

بوٹوں کی ٹاپ والے آدمی نے اب سے کچھ دیر پہلے جس بچے کو بری طرح پیٹا...... مجھے لگا...... یہ وہی بچہ تھا۔

اسی وقت میں نے یہ محسوس کیا کہ بچہ دھیرے دھیرے رینگتا ہوا آؤٹر سگنل کے پاس جا رہا تھا جہاں اس کی ماں حادثے کا شکار ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک اسی مقام پر پہنچا اور زور زور سے رونے لگا...... پاس ہی کھڑا خارش زدہ کتا بھی بہت اداس تھا...... لیکن دوسرے کتوں نے اس پر بھونکنا شروع کر دیا۔ رات کی خاموشی میں ہر تھوڑی دیر بعد بچے کے رونے کی آواز ملتی...... ٹھنڈک سے کانپتے ہوئے جسم میں گرمی لانے کے لئے اس نے خارش زدہ کتے کو زور سے دبوچ لیا تھا۔ شاید وہ اسی میں کوئی شفقت تلاش کر رہا تھا...... یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا...... جب کوئی تیز رفتار ٹرین گزرنے لگتی تو اس کے رونے کی آواز اور تیز ہو جاتی۔ ٹرین گزر جانے کے بعد نہ جانے کیوں وہ دیر تک پٹری پر ہاتھ رکھتا...... اسے محسوس کرتا اور دیر تک انگلیوں کو پھسلنے دیتا...... پھر رونے کا سلسلہ شروع ہو جاتا...... اب وہ کسی شدید درد سے کراہ بھی رہا تھا۔

میرے دل میں ڈھیر سارے خیالات ابھرتے رہے۔ زندگی کا ایسا روپ شاید میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا...... ان لمحوں نے میرے ذہن کو بوجھل بنا دیا...... الاؤ کی گرمی بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی...... نیند کی دیوی میرے وجود کو بھی چھونے لگی تب اونگھنے والوں میں میں بھی شامل ہو گیا۔

الاؤ سرد ہونے پر کسی نے مجھے جگایا...... صبح ہونے میں کچھ ہی دیر تھی شاید۔ صبح کے آثار نظر آنے پر بھی ایک ہو کا عالم تھا۔ ہم تینوں دوست ایک دوسرے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر سامنے والی پرانی بوگی پر لگے ہوئے اپنے نئے پوسٹر کو دیکھ کر بہت خوش تھے کہ بوٹوں کی ٹاپ والا آدمی چنگھاڑ کر سرد الاؤ کے پاس بیٹھے ہوئے مزدوروں سے مخاطب ہوا۔

'ارے بدھنا...... رگھوا...... موتیا...... دیکھ آؤٹر سگنل پر حرامی بچے کی لاش پڑی ہے...... سردی سے سکڑ کا مر گیا ہے سرا...... پاس والے دریا میں اٹھا کر پھینک دے اسے۔ نہیں تو گندگی پھیل جائے گی...... چل جلدی سے نمٹا یہ کام......'

تینوں مزدور اس لاش کو اٹھا کر دریا کی طرف بڑھنے لگے۔ خارش زدہ کتا ان کے پیچھے پیچھے تھا...... لاش دریا میں پھینک دی گئی۔ تب میں کچھ بولنا چاہ رہا تھا کہ پوسٹر سامنے آ گیا۔

بچے کی لاش آج بھی موجوں کے ساتھ نہ جانے کس سفر پر ہے۔ ■

اندر آگ ہے

کولیری کے مزدوروں میں بے چینی تھی۔ سبھوں کو خبردار کر دیا گیا تھا کہ آگ اندر ہی اندر پھیل رہی ہے۔ بہت ممکن ہے کہیں سے کوئی دھماکہ بھی ہو۔ زمین کے اندر کام کرنے والے مزدور تیزی سے اوپر آ رہے تھے۔ ان کی بستیوں میں شور تھا۔ ٹھیکہ داروں کے کہنے پر بھی ایک جگہ جمع ہوئے اور پھر حکمت عملی پر غور کیا جانے لگا۔ کالا سونا اندر ہی اندر دہک رہا ہے۔ اس تصور نے سبھوں کے مستقبل کو بھی متاثر کر دیا تھا۔

انجینئر اپنے کاموں میں لگے تھے جہاں سراغ ملتا زمین بے آبرو کی جاتی لیکن بہت اندر جانے پر بھی آگ کا نہ ملنا تشویش کا باعث ہوا۔ سائنس کی ایسی ناکامی کا تصور وہ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ آگ تو سچ مچ اندر ہے۔ جانچ کے ہر عمل سے آگ کے ہونے کا خاص امکان ملتا۔

جب تمام تر کوششوں اور پورے یقین کے باوجود زمین کی تہہ میں جانے پر بھی آگ نہ ملی تو سبھی مزدوروں نے رائے دی کہ ہمیں پہلے کی طرح کام کرنے دیا جائے۔ ہم خود ہی اپنی حفاظت کر لیں گے لیکن کسی بھی قیمت پر انہیں اجازت نہیں دی گئی۔ کئی دنوں کی کڑی محنت اور اعلیٰ سطحی تکنیکی جانچ کے باوجود جب دہکتے ہوئے انگاروں کا اندازہ نہیں ہو پایا تو تمام ماہرین نہ صرف یہ کہ اپنی کوششوں میں ناکام رہے بلکہ ان کے اعتماد کو بھی سخت ٹھیس پہنچی تھی۔

اور پھر ایک رات کی گہری خاموشی سے ابھری ایک عورت سُکھیا۔ سُکھیا بہت دنوں سے چپ ہے۔ اسے مینا پالنے کا بہت شوق ہے۔ مینا کے بولنے پر اس کا جی بہل جایا کرتا تھا۔ لیکن ان دنوں نہ جانے کیوں مینا بھی چپ چپ ہے۔ جب اندر آگ پھیلی اور یہ خدشہ بھی ظاہر کیا گیا کہ مزدوروں کی بستیاں بھی کسی وقت زمین دوز ہوسکتی ہیں تو سبھی مزدور سائنس دانوں کے ذریعہ طے شدہ محفوظ مقامات پر جمع ہوکر کیرتن گانے لگے لیکن سُکھیا ان میں شامل نہیں ہو پائی بلکہ اس نے اپنا گھر بھی چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ کبھی کبھی گہری خاموشی سے اوب کر مینا کچھ بولنے لگتی تو سُکھیا مسکرا دیتی۔ چونکہ سُکھیا کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اپنا توازن کھوچکی ہے شاید اسی لئے اس کے کسی بھی عمل پر اب کسی کا کوئی خاص ردعمل نہیں ہوتا۔ وہ باضابطہ طور پر کام پر بھی نہیں جایا کرتی تھیں۔ ٹھیکہ داروں کی ڈانٹ کا بھی اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔

سُکھیا چپ کیوں ہوگئی ہے؟

اتنے بڑے حادثے پر بھی سُکھیا کا کوئی ردعمل نہیں؟

جب وہ عام مزدوروں کے ساتھ کام کیا کرتی تھی تب بھی اسے کوئلے کے اندر کچھ تلاش کرتے ہوئے پایا گیا تھا۔ کوئی سونا نہیں۔ کوئی قیمتی پتھر نہیں۔ بلکہ اس کا کہیں کچھ کھوگیا تھا۔ شاید وہیں کہیں دفن تھا جسے وہ اکثر کریدا کرتی بلکہ وہ کسی دبی ہوئی ایسی شئے کی تلاش میں تھی جس کے حاصل ہونے پر اس کی تمام تر خوشیاں لوٹ سکیں گی۔

سُکھیا کوئی غیر معمولی عورت نہیں ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ ہر رات نشے میں چور اپنے مزدور پتی رام دین کی اذیتوں کا شکار ہونے کے باوجود ہر صبح ایک نئی امید کے ساتھ اس کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کو تیار ہوجایا کرتی تھی۔ رام دین کو یہ اعتراف تھا کہ وہ سُکھیا پر بہت ظلم کرتا ہے۔ دوسرے مزدور اس کی ایسی حرکتوں کی کافی ملامت بھی کیا کرتے تھے لیکن پھر شام

ڈھلے اس پر ایسی وحشت طاری ہوتی کہ کبھی کبھی وہ اپنی جھونپڑی کے تمام چھوٹے بڑے سامانوں کو غصے میں باہر نکال کر پھینک دیتا۔ سکھیا اذیت برداشت کرنے کے باوجود اسے بہت برا بھلا کہتی جاتی۔

رام دین بے حد محنتی مزدور تھا۔ جب وہ نشے میں ہوا کرتا تبھی اپنی متضاد شخصیت کے ساتھ سامنے آتا لیکن نارمل حالات میں وہ تمام مزدوروں کے لئے سب سے زیادہ ہمدرد دوست ثابت ہوا کرتا۔ جب کبھی کوئی مزدور ٹھیکہ داروں کے ظلم کا شکار ہوا کرتا تو رام دین سب سے پہلے ان کی مخالفت کرتا بلکہ ایک بار ایک بیمار مزدور سائمن باسکی کی جوان بیوی کو ایک ٹھیکہ دار کے چنگل سے اس نے چھڑایا بھی اور پھر تمام مزدوروں کے تعاون سے کافی کوششوں کے بعد ٹھیکہ دار کو جیل بھی بھجوا دیا لیکن جب جلد ہی ٹھیکہ دار کو رہا کر دیا گیا تو رام دین مایوس رہنے لگا بلکہ اب وہ نشے کی حالت میں کچھ زیادہ ہی پریشان رہنے لگا تھا۔ ان ہی دنوں کولری میں کام کا کچھ زیادہ بوجھ ہوگیا۔ مزدوروں کی تعداد بڑھی نہیں، بلکہ رات میں اوور ٹائم شروع ہوا۔ برسات کی وجہ سے کوئلہ نکالنے میں کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ بہت ساری سرنگوں کے دھنسنے کا بھی خدشہ درپیش آیا۔ پانی کے مسلسل بہاؤ کی وجہ سے ایک سرنگ کے دھنسنے پر کافی مالی نقصان بھی ہوا۔ جبکہ اس سرنگ میں کام کرنے والے مزدوروں کو بچالیا گیا تھا لیکن وہیں آس پاس کام کرنے والے مزدور رام دین کا اچانک غائب ہوجانا خاصے تشویش کا باعث ہوا۔ بہت چھان بین کے بعد پتہ چلا کہ سرنگ کے دھنسنے پر صرف رام دین کو نہیں بچایا جاسکا تھا۔ وہ وہیں دب کر مرگیا۔ سکھیا کے لئے یہ ایک غیر معمولی حادثہ تھا۔ وہ رو دھو کر چپ ہوگئی لیکن اس کے اندر کہیں کوئی پھانس باقی تھی۔ ایک ہی سوال اس کے ذہن میں ابھرتا کہ ایسے کیسے ہوسکتا ہے کہ سبھی اس حادثے میں زندہ رہ گئے اور میرے پتی کی ہی جان چلی گئی؟ پھر وہ کئی سطحوں پر خود کو کریدنا چاہتی لیکن کسی ٹھوس نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ اس کا گھر ایک دم خاموش ہوگیا تھا۔ سکھیا کے

ساتھ مینا کا بھی چپ ہو جانا کسی غیر معمولی حادثے سے کم نہ تھا۔

اسے رام دین کی موت کے سلسلے میں جو تشویش تھی وہ غلط بھی نہیں۔ لیکن وہ کس سے کہے؟ کوئی اپنے آپ کو کسی بھی ذہنی الجھن میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ سبھوں کو کسی ٹھوس ثبوت کی ضرورت تھی۔ کسی بھی وقت کسی بھی مزدور کے ساتھ کسی بھی حادثے کا رونما ہونا بہت معمولی سی بات تھی۔

لیکن یہ کوئی معمولی حادثہ نہیں تھا۔ ہوا یوں تھا کہ اس رات سچ مچ بہت تیز بارش تھی۔ زمین کے اندر مزدور اپنے کاموں میں لگے تھے لیکن رام دین ان میں شامل نہیں تھا۔ کسی بھی طرح پانی کے بہاؤ کو روکنا اس کا کام تھا۔ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہوا۔ سرنگ کے اندر اس نے پانی کو جانے سے سچ مچ روک دیا اور ٹھیکہ دار اس پر بہت خوش ہوا۔ تب اس نے رام دین کو اپنی چھتری میں بلایا۔ وہ اس کے پاس گیا اور پھر ایک چٹان کی اوٹ میں رام دین نے ٹھیکہ دار کی دی ہوئی شراب پی اور چند لمحے بعد وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ ٹھیکہ دار نے پاس میں ہی ایک گڈھے میں اسے دھکیل دیا اور نہ جانے چھوٹے بڑے کتنے پتھروں سے رام دین کو کچل ڈالا اور پھر تیز بارش میں سرنگ کے دھنسنے پر یہ معاملہ وہیں دفن ہو گیا۔

بارش کے تھمنے کے کچھ روز بعد ہی پتہ نہیں کیسے اندر ہی اندر آگ پھیلنے لگی جبکہ اتنی تیز بارش کے بعد ایسا ہونا شاید عام لوگوں کے لئے فطری نہیں تھا۔ لیکن آگ تو اندر ہی اندر بہت تیزی کے ساتھ پھیل رہی تھی۔ اب اسے ثابت کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی لیکن اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود دہکتے ہوئے انگاروں کا کہیں نام و نشان نہیں مل پا رہا تھا۔ یہ واقعی عجیب معاملہ تھا جبکہ زمین بھی جگہ جگہ دھنس رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے مکان منہدم ہو رہے تھے پھر بھی جس آگ کا انتظار تھا اسے اب تک کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

آج جب سکھیا کی کٹیا بھی دھنسنے لگی تو وہ مینا کا پنجرا لے کر رات کے اندھیرے میں کھونے لگی۔ ٹھیکہ دار اس کا پیچھا کرنے لگا لیکن بہت کوششوں کے باوجود وہ سکھیا کو تاریکی میں تلاش نہیں کر سکا۔ سکھیا چلتے چلتے تھک گئی تو ایک جگہ بیٹھ گئی۔ پنجرا پاس ہی میں رکھ دیا اور نہ جانے کب اسے نیند آ گئی۔

صبح ہونے لگی تو وہ اچانک چونک اٹھی۔ سب کچھ خاموش ضرور تھا لیکن ہر منظر کو کسی بھی آہٹ پر بولنے کا انتظار تھا۔ سکھیا نے پنجرا دیکھا۔ مینا کو کسی طرح پنجرے سے باہر نکالا۔ دھیرے سے اسے زمین پر رکھا لیکن جیسے ہی مینا نے زمین کو چھوا اس نے وہیں دم توڑ دیا۔ سکھیا بلک بلک کر رونے لگی۔ مینا کا ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جانا، اس کا دم توڑ دینا ایک ایسا حادثہ تھا جس نے ہر خاموشی کو اچانک بولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سکھیا زور زور سے چیخنے لگی۔ وہ مزدوروں کو پکارنے لگی۔

'دوڑو...... جلدی آؤ...... دیکھو یہاں آگ ہے......

بہت آگ ہے یہاں...... جلدی آؤ......'

اور سچ مچ اس جگہ سے جیسے ہی رام دین کی لاش برآمد ہوئی چاروں طرف دہکتے ہوئے انگاروں کا پتہ مل گیا۔ یہی انگارے تیزی سے مزدوروں کے وجود میں منتقل ہونے لگے۔ ■

کتاب

اسے کون سی کتاب مل گئی ہے۔ میں نہیں جانتا، وہ لوگوں سے چھپ کر اس کو پڑھتا ہے، سوچتا ہے، کبھی مسکراتا ہے تو کبھی جی بھر کے رو لیتا ہے۔ آخر کیا کچھ ہے اس کتاب میں۔ کوئی ناول ہے، طویل افسانہ، داستان یا پھر...... وہ اس قدر حسّاس ہے کہ آہٹیں بھی سرگوشیاں کرنے لگتی ہیں تو اسے خبر مل جاتی ہے۔ کتاب کو بند کر دیتا ہے۔ پھر کہیں چھپا دیتا ہے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس کے جانے کے بعد میں چپکے سے اس کے گھر میں داخل ہوا تھا۔ کتابوں سے بھری پُری اس کی دنیا کو بغور دیکھ کر اس کتاب کی تلاش کرنے لگا لیکن کوششوں کے باوجود کامیابی نہیں مل پائی۔ جب میں نے ایک روز اس سے پوچھ لیا کہ

'آخر تم کیا پڑھتے رہتے ہو۔ چلو پڑھنا تمہارا ذاتی معاملہ بھی تصور کر لیتا ہوں لیکن ایسا کیا کچھ ہے کہ کسی کے آنے کی خبر سے ہی تم محتاط ہو جاتے ہو اور پھر......'

وہ میری بات سن کر ٹالنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں سمجھ جاتا ہوں کہ یہ کوشش رائیگاں ہونے والی ہے۔ مگر سلسلہ جاری رکھتے ہوئے پھر اسے دوسرے نہج پر لے جاتا ہوں۔

'تمہارا معاملہ بہت گمبھیر ہے۔ جانتا ہوں عموماً نئی کتابوں سے تم جلد ہی گزرنے کی کوشش کرتے ہو۔ مگر یہ بھی طے ہے کہ ان کتابوں میں تمہاری خاطر خواہ دلچسپی نہیں ہوا کرتی ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تم انہیں رسمی طور پر پڑھتے ہو۔ مگر پھر ان کتابوں سے متعلق جب تم سے گفتگو کی جاتی ہے تو اندازہ یہ ہوتا ہے کہ سب کچھ بہت انہماک سے پڑھا گیا ہے۔ تم یہ نہیں بتا سکتے کہ اب تک تمہیں سب سے زیادہ کس تحریر نے متاثر کیا ہے؟'

اس بار وہ میری بات سن کر نہ صرف یہ کہ مسکراتا ہے بلکہ زیر لب کچھ کہہ بھی جاتا ہے۔ جسے میں سمجھ نہیں پاتا اور وہ زور سے اسے بولنا ضروری بھی نہیں سمجھتا۔ اسے اپنی ایک کمزوری کا بخوبی علم ہے کہ کوئی اسے بار بار چھیڑتا ہے تو وہ صرف بولتا ہے کسی کی سن نہیں پاتا۔ دیر تک بولتا رہتا ہے۔ موضوع کا حصار خود بہ خود پھیلنے لگتا ہے، پھر یہ ٹوٹ بھی جاتا ہے۔ تا حد نظر ایک لامتناہی سلسلہ سر جوڑے کھڑا نظر آتا ہے۔ شعور کی رَو میں اس کا بہہ جانا ایک فطری عمل ہی کہا جاسکتا ہے۔ وہ دلِ عاشق کی طرح سمٹنا بھی جانتا ہے اور زمانے کی طرح پھیلنے کا فن بھی اس کے پاس ہے۔ میں اسے چھیڑتے وقت جانتا ہوں کہ اس کی داستان سنتے سنتے میں سو جاؤں گا لیکن وہ اُسے پورا ضرور کرے گا۔ یہ جانتے ہوئے کہ ایک خاص مقام کے بعد کوئی اسے سن نہیں پاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اب بہت کریدنے پر بھی وہ نہیں کھلنا چاہتا ہے۔ پتہ نہیں اسے ان دنوں کون سی کتاب مل گئی ہے کہ اب ہر سوال یا ہر تفصیل اس کے لئے بے معنی ہے۔ اب وہ جس کتاب کو پڑھتا ہے دراصل اس سے گفتگو بھی کرتا ہے۔ لفظوں کو چھوتا ہے۔ زندہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، اپنے خیالوں کے کینوس پر رنگ بھرتے ہی ایک لفظ کو کئی معنی عطا کرتا ہے۔ لفظ اس کے لب کو چومتے ہیں، گدگداتے ہیں۔ اور پھر کسی کی آہٹ سن کر کتاب میں چھپ جاتے ہیں۔ آج بھی ایسا ہی تھا کسی اجنبی کی آہٹ پر۔

خطرہ ٹل جانے کے بعد وہ پھر انہیں آواز دیتا ہے۔ دیر تک پکارنے کے باوجود جب لفظ زندہ نہیں ہو پاتے تو وہ کتاب کھولتا ہے اور لمحہ بھر کے لئے مضمحل ہو جاتا ہے۔ ہنستے بولتے ہوئے لفظوں کو اچانک کیا ہو گیا۔ ایسے بے جان اور بے حس ہو گئے! اس نے ایسا کچھ بھی نہیں کہا تھا کہ یہ اس حد تک ناراض ہو جائیں۔ وہ کسی آہٹ کو سن کر چھپ گئے تھے۔ حالانکہ اس کا یہ عمل اسے اچھا لگا تھا۔ وجہ صاف تھی کہ وہ غیروں سے مانوس ہونا نہیں چاہتے تھے۔ چلو ٹھیک ہے۔ اگر وہ ان سے رشتہ بڑھاتے تو دھیرے دھیرے اپنی شدت کھونے لگتے۔ ان کا ایسا سوچنا غلط نہیں تھا۔ شروع سفر میں، وہ ہر کس و ناکس پر یقین کر لیا کرتے تھے۔ ہر زبان پر اپنی معنویت کے ساتھ سجنے سنورنے کی

کوشش کیا کرتے تھے۔ بہتوں نے تو ان کے جذبے کا احترام کیا لیکن بدلتے ہوئے دور نے دل سے نکلی ہوئی زبان کو نہ صرف یہ کہ مجروح کیا بلکہ صرف لمحے بھر کی دوری نے اس کے چہرے کو مسخ کردیا۔ وہ دل سے مچلتے ہوئے نکلے اور ہونٹوں میں آکر مجروح ہو گئے۔

مگر آج تو ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ جس کے ساتھ چند دنوں سے بے حد خوش تھے، اس کی ایک آواز پر کتنے ہی پیراہن میں ابھرنے کی کوشش کرتے تھے بلکہ اس کے وجود پر اس قدر حاوی ہوا کرتے تھے کہ وہ کبھی کبھی خود کو جبریل امین تصور کرنے لگتا تھا۔ آج کسی کی آہٹ پر وہ بے جان ہو گئے۔ جب لفظوں نے بولنا بند کردیا۔ اس کے سمجھانے، چھونے، منانے پر بھی منجمد ہی رہے تو وہ پریشان ہوگیا۔ بس یہی تو اس کا سرمایہ تھا۔ دنیا کی نظروں سے بچا کر رکھا گیا تھا۔ کوشش تھی کہ اب اسے کوئی ٹھیس نہ پہنچے۔ وہ بے خوف ہوکر اپنی فضا کو معطر کرے۔ اپنے کھوئے ہوئے وقار کو لوٹانے کی کوشش کرے۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ جو بے گناہ قتل کردیئے گئے ان کا غم غلط کرنے کا عزم پیدا ہوسکے۔ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو رہے تھے۔ اسے اچھا لگ رہا تھا کہ اس بار جو لفظوں کی فصلیں ابھرنے والی ہیں وہ جذبوں کی پاکیزگی کو پھر بحال کردیں گی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اس کتاب کو پڑھتے سوچتے وقت اوروں سے چھپانا چاہتا تھا۔ لفظوں کی شرطوں سے بھی وہ مجبور تھا۔ میں اس شخص سے سب سے زیادہ قریب ہوں اور جانتا ہوں کہ وہ اپنے اصولوں سے کبھی سمجھوتہ نہیں کرسکتا۔ اسے وہ کتاب واقعی دل و جان سے عزیز تھی۔ وہ اپنے آپ کو دھوکہ دے سکتا تھا لیکن اس کتاب کو کبھی پامال نہیں ہونے دیتا۔ وہ سارا وقت انہیں سے گفتگو کرتا، سینے سے لگاتا، چومتا، بہت کچھ سرگوشیوں میں کہنے کی ہدایت دیتا۔ کسی نے چاہے جتنی بھی کوشش کی ہو لیکن کوئی راز کبھی ابھر کر سامنے نہیں آیا۔

جب وہ تھک گیا اور یقین ہوگیا کہ لفظ مرگئے یا بے جان ہو گئے تو اس کی بے چینی بڑھنے لگی۔ وہ اس کتاب کو مقدس کتابوں کے بیچ کچھ دیر تک رکھ دیتا کہ شاید اس کی حدت سے

ان میں بھی زندگی کی علامت پھر سے ابھرنے لگے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ اس کتاب کو لے کر پیغمبروں کے صحیفے کے درمیان گیا۔ یہاں بھی زندگی نہیں اُبھری۔ پھر اسے اچانک یہ خیال آیا کہ ان کے والدین سے ملتے ہیں شاید احتراماً ہی سہی کچھ بولتیں۔ کئی دعویداروں کے بیچ جانے پر بھی لفظ بے جان ہی رہے۔ وہ اس کتاب کے ساتھ دور تک پھیلے ہوئے سمندر کے کنارے جا کر بیٹھ گیا۔ یہاں وہ اپنے آنسوؤں کو نہیں روک پایا۔ دھیرے دھیرے لب کھولنے لگا۔

'بولو...... چپ کیوں ہو گئے۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ہے کہ تم اچانک اس طرح منہ پھیر لو۔ تم اگر چاہتے ہو کہ میں دور چلا جاؤں۔ میں تم سے کوئی رشتہ نہ رکھوں، تو میں اس کے لئے بھی تیار ہوں۔ میرے لئے تمہارے سوا کون ہے اب! تمہیں میرا افسانہ معلوم ہے۔ مجھے بھی بولنے کی سزا دی گئی تھی۔ لوگوں کے بہت کریدنے پر بھی جب میں بولتا تو صرف میری رسوائی ہی ہوا کرتی تھی۔ پھر ایک روز تم ملے اور مجھے نئی راہ دکھائی۔ دھیرے دھیرے تم سب مجھ سے مانوس ہوئے۔ میں بھی جو کر سکتا تھا، کرتا رہا۔ تمہارا محافظ بنا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایک کمزور شانے پر تمہارے وجود کو شاید میں بھی دور تک نہیں لے جا سکتا۔ ہو سکتا ہے تم نے بھی اب ایسا محسوس کر لیا ہو اور اچانک بے جان ہو گئے ہو۔ مگر سوچو کہ میں کہاں جاؤں؟ میں اپنے آپ کو شاید نہیں بدل سکتا، اور بدلنا بھی نہیں چاہتا۔ اگر تم چاہو تو میں اس سمندر میں اپنے آپ کو دفن کرنے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ تم غیر سمجھ بھی لو تب بھی الوداعی ساعتوں میں مَیں صرف تمہارے ساتھ ہوں۔ تم اب جہاں چاہو جا سکتے ہو۔ مجھے بھی چھوڑ سکتے ہو۔ سب کچھ بدل رہا ہے۔ تم بھی بدل جاؤ۔ مگر لوٹ آؤ۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں مر جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے میں کل ابھرنے والا سورج بھی نہ دیکھ پاؤں۔ مرنے والے کی آخری خواہش پوری کرتے ہیں اسی لئے ایک بار ہی صرف ایک بار تم مجھے چین سے مرجانے کے لئے زندہ ہو جاؤ۔ میں تمہاری زندگی چاہتا ہوں۔ بس ایک بار......بس ایک بار......

وہ، دھیرے دھیرے مکمل طور پر بھیگ جاتا ہے۔ سمندر کی موجیں اسے چھونا تو چاہتی ہیں، مگر ایسا نہیں کر پاتیں۔ موجیں اس کے قدموں کے بالکل پاس آ کر بکھر جاتی ہیں۔ پھر ایسا محسوس ہوتا ہے لوٹ رہی ہیں۔ وہ اس منظر کو دیکھ کر زور زور سے رونے لگتا ہے۔ کتاب اس کے سینے سے لپٹی ہوئی ہے۔ جب وہ روتے روتے تھک جاتا ہے تو پھر موجوں کو چھونے کی کوشش میں دھیرے دھیرے بڑھنے لگتا ہے، موجیں اس کے وجود کو جیسے ہی چھوتی ہیں، کتاب پگھلنے لگتی ہیں۔ سمندر کی موجوں کی نمی سے لفظوں میں دھیرے دھیرے زندگی آنے لگتی ہے۔ وہ بھی اسے محسوس کرتا ہے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ وہ فرط جذبات سے سمندر میں کچھ اور دور تک چلا جاتا ہے۔ لفظ دھیرے دھیرے کتابوں سے نکل کر جیسے ہی سمندر کی موجوں پر گرتے ہیں، وہ چلانے لگتا ہے۔ موجیں لفظوں کے ساتھ اسے اپنے حصار میں لینے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس نے تب بہت پیار سے چھوتے ہوئے اس سے پوچھا تھا کہ کس کی آہٹ پر تمہیں اتنا صدمہ ہوا کہ بے جان سے ہو گئے۔ لفظوں نے اپنی شبیہ درست کرتے ہوئے کہا۔

’آنے والا شخص ہماری شکل بدلنا چاہتا تھا۔ وہ ہمارے لئے ایک نیا لباس لے کر آیا تھا۔ ذرا سوچو موت کے علاوہ ہمارے پاس تھا کوئی راستہ؟ تم کب تک تنہا میرے محافظ بن کر رہتے؟ اس سے پہلے کہ وہ ہمارا قتل کریں، ہم عزت سے مرنا چاہتے ہیں۔ تم شاید نہیں بچا پاؤ گے ہمیں کہ اس میں تمہارے دوست بھی شامل ہیں۔ آؤ ہم اِن موجوں میں شامل ہو جائیں کہ بہت جلدی دھرتی سے پانی ختم ہوگا تو ساری خدائی کو اس سمندر کا سہارا ہوگا۔ آؤ کہ ہم موجوں کے ساتھ لوٹ چلیں۔

اور پھر دھیرے دھیرے وہ لفظوں کو اپنی گود میں لے کر اس بے کراں سمندر میں ضم ہو جاتا ہے۔ ■

سائمن باسکی

جلوس تھم گیا۔

چاروں طرف عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ ہوا میں لہراتے ہوئے ہاتھ پتھر ہو گئے۔ سب کی نگاہیں مشکوک، 'چہروں کی لکیروں' میں سوالات ابھرتے اور پھر وہیں ڈوب جاتے۔ خوف کی پرچھائیوں نے اپنا دائرہ وسیع کیا۔ رات کی تاریکی میں مشعل کی روشنی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ آگے بکھری ہوئی بارود۔ کوئی ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا تھا۔ ایک شخص بھی اگر اس لکیر کو پار کر جاتا تو دیکھتے ہی دیکھتے کتنی زندگیاں تباہ ہو جاتیں۔ اس جلوس میں عورتیں، معصوم بچے، بوڑھے اور جوان سبھی تھے۔ انھیں اپنا حق چاہئے تھا۔ ان سبھوں نے اس لڑائی میں اپنا بہت کچھ کھویا تھا۔ اب آگے کچھ بھی کھونے کو تیار نہیں تھے۔ یہ سلسلہ تو صدیوں سے قائم ہے۔ ان کے لبوں پر کچھ دیر کے لیے مسکراہٹیں بکھرتیں اور اس کے بعد پھر سے بوجھل پلکیں لئے کام کرنا پڑتا تھا۔ سبھی ایک بڑی ندی پر پُل بنانے کے لیے رکھے گئے تھے۔ ان کی تعداد دس ہزار سے زیادہ تھی۔ پُل کی تعمیر کا کام پچھلے آٹھ برسوں سے تیزی کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس عرصے میں کئی بار موسم بدلا، حالات کے نقشے میں معمولی تبدیلی آئی۔ مزدوروں کے کئی بے نام چہرے دھوپ کی تپش سے جھلسا گئے۔ ان میں سے اکثر حادثے کے شکار بھی ہوئے۔ لیکن کام یوں ہی چلتا رہا۔ ایک مزدور آواز اٹھاتا تو دوسرا اُسے دبانے کی کوشش کرتا۔ کوئی ایک دوسرے کا دشمن نہیں تھا۔ لیکن بھوک کا مسئلہ بہرحال اہم رہا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ ان کی موت پر کوئی سوگ منائے۔ ماحول کچھ ایسا تھا کہ تقریباً سبھی حادثے کی ذمہ داری خود پر ہی لینے کو تیار رہتے۔ کئی آوازیں

ابھریں، تقریریں کی گئیں لیکن ان سب کا حاصل کیا تھا؟ پھر سفر اسی جگہ سے شروع کرنا پڑتا۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ حالات کو بدل دینے کا جذبہ اپنے اندر نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن جب ظلم اپنی حدود سے بہت آگے بڑھ گیا تو اُن میں سے ہی ایک لیڈر ابھر کر سامنے آیا۔ سائمن باسکی۔

وہ پڑھا لکھا تھا لیکن بہت زیادہ جذباتی۔ غلط جگہ پر سمجھوتہ کرنے سے گریز کرتا۔ پھر بھی اکثر حالات کے آگے مجبور بھی ہوا۔ مزدوروں کی اکثریت نے اس کا ساتھ دینا شروع کیا۔ لیکن کچھ لوگ ہمیشہ اس کی آواز پر لبیک نہیں کہتے تھے۔ کبھی کبھی ان میں اختلاف بھی ہوتے۔ سائمن باسکی کو جو لوگ صحیح معنوں میں اپنا سچا لیڈر مانتے تھے، انھیں زیادہ پریشان کیا جاتا تھا۔

سائمن اپنی بیوی، دو جوان بیٹیوں اور ایک دس سالہ بچّے کے ساتھ پُل کی تعمیر میں جٹا رہتا تھا۔ جب کہیں کسی کے چیخنے کی آواز ابھرتی تو وہ دوڑتا ہوا اس جگہ پر جاتا۔ ٹھیکے دار حسبِ معمول ان پر وار کر رہا ہوتا۔ سائمن کے آتے ہی دوسرے مزدور بولنے لگتے۔ ٹھیکہ دار کچھ سہم جاتا اور اپنے آپ کو چھپانے کے لیے سائمن سے مخاطب ہو کر کہنے لگتا۔

'ہونہہ، تم مزدوروں کے لیڈر بنتے ہو؟ کہتے ہو کہ ہم پر ظلم ہو رہا ہے۔ ہمیں اتنی مزدوری نہیں ملتی، جتنا ہم کام کرتے ہیں۔ کیا اس کو محنت کہتے ہیں کہ یہ دو گھنٹے سے چھاؤں میں سو رہا تھا۔ ہم کہاں تک برداشت کریں گے۔ تمھیں بھی تو سمجھنا چاہیے۔'

ٹھیکہ دار بولتا رہتا اور سائمن مزدوروں کو وہاں سے ہٹانے کی کوشش میں رہتا۔ کچھ دیر بعد سبھی اپنے اپنے کام میں لگ جاتے۔ وہ بھی اپنی جگہ پر لوٹ آتا۔ پھر دیر تک اسے ذہنی پریشانی میں مبتلا رہنا پڑتا۔ آخر ہم ان لوگوں کو کس طرح سمجھائیں جو بالکل محنت کرنا نہیں چاہتے۔ ہم اس جگہ پر کمزور ہو جاتے ہیں۔ کچھ ایسے مزدور تو ہیں ہی جو ہم سب کو بدنام کر رہے ہیں۔ انھیں آخر کس طرح سُدھارا جا سکتا ہے؟ ٹھیک ہے، اگر ان میں محنت کرنے کی صلاحیت نہیں تو مالک انھیں نکال کیوں نہیں دیتا۔ ہم تو نہیں کہہ سکتے کہ انھیں ہٹا دیا جائے، اس لئے کہ ان پر جو ذمہ داریاں ہیں، انھیں کون پورا کرے گا؟ مالک سب کچھ جانتا ہے۔ اسے کچھ بھی

بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم کیوں بدنام ہوں گے؟ ان کی یہ سازش کبھی رنگ نہیں لائے گی۔ کچھ ایسے بھی مزدور ہیں یہاں جو صرف غنڈہ گردی میں وشواس رکھتے ہیں۔ یہ سب مالک کے خاص آدمی ہیں۔ یہ کسی وقت بھی خطرہ پیدا کر سکتے ہیں۔

سائمن چھٹی کا سائرن بجتے ہی بیوی بچّوں کے ساتھ اپنے بیرک میں لوٹ آتا۔ یہاں بھی دھوپ کی تپش ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ چھت گرم ہو جانے کی وجہ سے رات گئے تک انھیں نیند نہیں آتی۔ رات کے کسی حصّے میں پاس والے بیرکوں میں ہنگامہ شروع ہو جاتا۔ وہ جب کبھی نہیں جا پاتا تو اکثر ایسا بھی ہوا کہ صبح اٹھتے ہی کسی مزدور کی لاش پائی گئی۔ قتل کا الزام بھی کسی مزدور پر ہی ہوتا۔ کچھ دنوں تک سائمن باسکی کے خلاف بھی آوازیں بلند کی جاتیں اور جب دھیرے دھیرے حالات لوگوں کے قابو میں ہو جاتے تو سائمن اور عظیم بن جاتا۔ اکثر ٹھیکہ دار رات گئے اس کے بیرک میں آتا اور سائمن کو مالک کے پاس لے جاتا۔ مالک مزدوروں کے احوال دریافت کرتا۔ اسے چائے پلائی جاتی اور جب وہ لوٹتا تو کچھ لوگ اس کے منتظر ہوتے۔ پھر بہت دیر تک سائمن کو ان سے الجھنا پڑتا۔ بیٹیاں دروازے پر اپنے باپ کی باتوں کو دھیان سے سنا کرتیں۔ ان دونوں کو اکثر اس ماحول سے خوف سا لگتا۔ وہ چاروں طرف سے اپنے آپ کو گھِرا ہوا محسوس کرتیں۔ تھکن کے باوجود کبھی گہری نیند میں نہیں ڈوب پائی تھیں۔ ٹھیکہ دار کی آواز پر صرف چونکتی ہی نہیں بلکہ بابا کو جھنجھوڑ کر اُٹھا دیتیں۔ ماں سے اکثر گالیاں سننے کو ملتیں۔ جب بابا جگ جاتا تو کسی حد تک دونوں خود کو محفوظ سمجھتیں۔ ٹھیکہ دار انھیں گھورتا رہتا اور سائمن نیند میں ان کے سوالوں کے جواب دیتا رہتا۔

ایک دن سائمن کی بڑی لڑکی کو کام کرنے کے لیے بیچ ندی میں بھیج دیا گیا۔ وہ حادثے کا شکار ہو گئی — اس کی لاش ندی میں کہیں کھو گئی — پھر کچھ دنوں بعد موت سے بھاگتی ہوئی رات کے پچھلے پہر وہ اپنے بیرک میں پہنچی، جیسے ہی دروازہ کھلا وہ سائمن پر جھول گئی۔ اس کا سارا جسم لہولہان ہو رہا تھا۔ سائمن چیختا رہا...... بھیڑ جمع ہوتی رہی اور اس بیچ اس کی بیٹی نے سچ مچ موت کو گلے لگا لیا۔

کچھ دنوں بعد سائمن نے چندہ جمع کر کے اخبار نکالنا شروع کیا۔ مزدوروں کے حلقے میں اس اخبار کو پڑھنے والوں کی تعداد کم تھی۔ لیکن جب باہر کی دنیا میں اس اخبار کو پڑھا جاتا تو کچھ لوگ اس سے ملنے آتے۔ انھیں مکمل طور پر حالات سے آگاہ کیا جاتا۔ ان کے وعدے مزدوروں میں کئی خوبصورت خواب بن کر ابھرتے۔ یہ سلسلہ کچھ دنوں تک چلتا رہا۔ بیداری بڑھتی رہی۔ لیکن ان میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ ان کے دکھ درد کو سمجھنے والے اپنی شہرت کے پیچھے بھاگتے رہے۔ ان کی ہمدردی حاصل کرنے والوں کا مستقبل تابناک ہوا۔ لیکن انھیں اندھیرے سے کون نکالتا۔ کسی میں حوصلہ نہیں تھا۔ سب کچھ دکھاوا، بے بنیاد باتیں۔ آخر کب تک ان کے سہارے زندہ رہا جاسکتا تھا۔ کچھ دنوں بعد سائمن باسکی کی آخری بیٹی بھی حادثے کا شکار ہوگئی۔ اسے بھی ندی نے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ موجیں اس کے جسم سے کھیلتی رہیں۔ پھر خون کے دھبے ساحل پر دور دور تک پھیل گئے۔

سائمن باسکی نے تحریک اور تیز کردی۔ اب اسے ان سے لڑنا تھا۔ ان کے خلاف ثبوت حاصل کرنا تھا۔ لیکن یہ کس طرح ممکن تھا۔ ان کی تعداد محدود تھی۔ لیکن ذرائع بہت دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اسے بھی تھک کر بیٹھ جانا ہوگا۔ جب کبھی وہ اپنے بیچ کے لوگوں سے مایوس ہو جاتا تو اچانک اس کالڑکا جھنجھوڑ دیتا۔ لڑائی تیز ہوتی گئی۔ مزدوروں کی ایک بڑی تعداد اُبھر کر سامنے آئی۔

دن بھر مختلف راستوں سے گزرتا ہوا یہ جلوس رات کے کسی حصے میں اس مقام پر پہنچا جہاں انھیں انصاف ملنے کی امید تھی۔ سائمن باسکی ہی ان کا لیڈر تھا۔ اس کے ایک اشارے پر سارے لوگ خاموش ہوگئے۔ سبھی اپنے لیڈر کو مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اجتماعی طور پر یہ سوال سامنے آیا کہ اس جگہ پر ہم بھی خاموش کیوں ہو گئے جہاں سبھی احتراماً خاموش رہتے ہیں۔ آگے بارود کا ڈھیر تھا۔ اس ڈھیر سے انھیں گزرنا ہی تھا۔ سائمن کا سر جھک چکا تھا۔ پھر اس نے مشعل کی روشنی کو خون آلود نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ چہرہ بالکل سرخ ہو چلا تھا۔ وہ بہت کچھ بولنا چاہتا تھا۔ لیکن بولنے سے کیا فائدہ؟ خاموش احتجاج کی ضرورت ہے۔ وہ یہ سوچ

رہا تھا کہ اب تک بول کر ہم نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ انھیں ہماری کمزوریوں کا علم ہو چکا ہے۔ اب جو آواز ابھری تو پھر کوئی ایسا راستہ سامنے آجائے گا جہاں سے ہم آگے نہیں بڑھ سکتے ہیں۔ لیکن اس لکیر سے آگے بڑھنا ہوگا جسے چھو کر اکثر لوٹنا پڑا ہے۔ سائمن بارود کے ڈھیر کی طرف بڑھنا ہی چاہ رہا تھا کہ اس کی بیوی سامنے آگئی اور اس کے پاؤں پر گر گئی۔ چند لمحے بعد اس نے سائمن کے چہرے کی طرف دیکھا اور لوگوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگی—

''ہم اس لڑائی میں کئی بار ہار چکے ہیں۔ بہت کچھ مٹ چکا ہے۔ اب جو آگے قدم بڑھایا تو چاروں طرف آگ پھیل جائے گی۔ ہم میں سے زیادہ تر لوگ یہیں دم توڑ دیں گے۔ یہ سلسلہ اتنی آسانی سے ختم نہیں ہوسکتا۔ جو کچھ بھی ہمارے پاس بچا ہے، کیا اس کی ہم حفاظت نہیں کر سکتے؟ ایسا لگتا ہے کہ ہم کمزور ہیں۔ بہت کمزور ہیں ہم۔ ہمارے پاس صرف ایک بیٹا ہے اور وہ بھی مزدور ہے، سائمن باسکی کی طرح۔ سائمن اسے پڑھاتے وقت بھی ظلم کے خلاف احتجاج پر زیادہ زور دیتا ہے۔ ایسے کئی بچے ہیں ہمارے بیچ جو آگے چل کر اس بھیڑ کی شکل میں ابھریں گے اور پھر ہم سب کی طرح انھیں بھی اسی جگہ پہنچنا ہوگا۔ لیکن اس کا حاصل کیا ہے۔ ہماری جوان بیٹیوں اور بیٹوں کی بلی! نہیں اب ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ سمجھ لو کہ تھک گئے ہیں ہم لوگ۔ حالات جیسے ہیں، ویسے ہی رہنے دو۔ سب کچھ اسی طرح چلتا رہے گا۔ ہم اب کوئی تبدیلی نہیں چاہتے ہیں۔ ہمیں اب کوئی تبدیلی نہیں چاہئے۔ سب کچھ ٹھیک ہے۔ ہم بھی سکھی ہیں۔ اب کوئی تبدیلی نہیں......'

اور پھر بھیڑ میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ تمام ہاتھ دھیرے دھیرے جھکنے لگے۔ لوگ تھک کر بیٹھنا ہی چاہ رہے تھے کہ سائمن باسکی کا اکلوتا لڑکا بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ وہ چلاّ رہا تھا لیکن اس کی آواز سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ پھر خود بہ خود لوگ آگے بڑھنے کے لئے اسے راستہ دینے لگے۔ اس نے سائمن باسکی کے ہاتھ سے مشعل لی اور تیزی سے اس لکیر کے آگے بڑھ گیا۔

آگ اب بھی پھیل رہی ہے۔ پھیلتی ہی جارہی ہے۔ عجب نہیں کہ ہم سب کے وجود پر بھی حاوی ہو جائے۔ ■

سُبا رو نہیں سکتی

سکندر جان کی بیٹی سُبا صرف چھ سال کی تھی تو اس کی ماں چل بسی۔ سکندر جان نے زندگی کو اس طرح جینے کے لئے سوچا بھی نہیں تھا بلکہ آنے والے تیس برسوں کے لئے اپنی سطح پر سب کچھ پلان کر رکھا تھا۔ ان کے لئے سُبا اور اس کی چھوٹی بہن جوہی کی پرورش کا مسئلہ تھا۔ جوہی بھی تب کوئی چار سال کی رہی ہوگی۔ کچھ روز تک تو انہیں ایسا لگا کہ وہ ان دونوں کی تنہا پرورش نہیں کر پائیں گے لیکن جب حسبِ معمول دونوں اسکول جانے لگیں بلکہ ایک دوسرے کو تیار کرنے میں مدد کرنے لگیں تو انہیں ایسا لگا کہ اگر دو سال تک بھی دونوں نے ایسا کچھ کرنے کے لئے خود کو عادی بنا لیا تو ان کی الجھنیں بہت حد تک کم ہو جائیں گی اور بعد میں ہوا بھی ایسا ہی۔ لیکن ایک زبردست تبدیلی یہ ضرور آئی کہ پہلے وہ دفتر سے لوٹتے تھے تو دونوں ان سے لپٹ جاتی تھیں بلکہ اپنی اپنی فرمائشوں کے دفتر بھی کھول لیا کرتی تھیں، لیکن اب ایسا کچھ نہیں ہوتا تھا۔ دفتر سے لوٹنے کے بعد جب نوکرانی چائے لے کر آتی تو ہمیشہ ہی پتہ چلتا کہ دونوں اپنے کمرے میں پڑھ رہی ہیں۔ وہ اکثر دونوں کے پاس چلے جاتے اور پھر انہیں پیار کرنے لگتے۔ اب ان کی فرمائش نہیں ہوا کرتی تھیں بلکہ سکندر جان خود ہی دونوں کے لئے کچھ نہ کچھ لے آیا کرتے۔ اس پر دونوں کے تاثرات یہی ہوتے۔ 'تھینک یو پاپا'

ایک بار سُبا بہت بیمار ہوگئی۔ نہ جانے کیوں اس کے سر میں کافی درد رہنے لگا تھا۔ اسے دوا لا کر دی گئی، لیکن اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ دن بھر روتی رہتی۔ اپنے پاپا کے دفتر اور جوہی کے اسکول جانے کے بعد وہ اور بھی تنہا ہو جاتی۔ دن بھر زور زور سے روتی رہتی۔ یہاں

تک کہ تنگ آ کر نوکرانی بھی اسے چھوڑ کر چلی جاتی اور دو تین گھنٹہ بعد لوٹتی تو سُبا سو چکی ہوتی۔

ایک روز نوکرانی اور پڑوسیوں نے سکندر جان سے شکایت کی کہ آپ کی بیٹی آج کل اسکول نہیں جاتی۔ دن بھر روتی رہتی ہے۔ جس سے ہم لوگ بہت ڈسٹرب ہوتے ہیں۔ ان دنوں سکندر جان بھی اپنے دفتر کو لے کر بہت پریشان تھے۔ انہوں نے شام کے وقت بہت غصے میں سُبا کو بلایا۔ وہ ان کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔

'کیا ہوا ہے۔ کیوں چلاتی رہتی ہو؟'

'پاپا سر میں بہت درد رہتا ہے۔'

'دوا تو دی ہے لا کر۔'

'تو میں کیا کروں؟'

'مر جاؤ تم...... اور سنو اب جو روتے ہوئے سن لیا تو تمہاری ٹانگ توڑ دوں گا۔ جاؤ اپنے کمرے میں جاؤ...... چلو بھاگو......'

وہ دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ سکندر جان بھی تیزی سے گھر سے باہر نکل گئے۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر کے ساتھ لوٹے تو سُبا سو چکی تھی۔ انہوں نے بہت پیار سے اسے جگایا۔ ڈاکٹر نے اس کا چیک اپ کیا۔ بعد میں اس چھوٹی سی عمر میں ہی اسے چشمے کی ضرورت ہوگئی۔ اب وہ جوہی کے لئے سچ مچ کم عمر کی پکی دیدی بن گئی۔

ایک روز جب سکندر جان خود ہی سُبا کو پڑھا رہے تھے تو انہوں نے اسے سمجھایا 'بیٹی مصیبتوں سے لڑنا سیکھو۔ تم اتنی جلدی گھبرا جاؤ گی، رونے لگو گی تو سوچو تمہاری چھوٹی بہن پر اس کا کیا اثر ہوگا...... تم تو بہادر ہو۔ اپنے پاپا کی اچھی سی بیٹی ہو۔ بہادری تو اس میں ہے کہ تم سب کچھ سہہ لو۔ کسی کو کبھی پتہ بھی نہ چلے۔ تم خود ہی پڑھ رہی تھی نا کہ اگر کندن جیسا ہونا ہے، زندگی میں ہمیں کچھ کرنا ہے تو سونے کی طرح آگ میں تپنا ہوگا......'

اس روز اس نے بہت دھیان سے اپنے پاپا کی بات سنی تھی۔ تھوڑا سا مسکرائی تو اس سے پاپا کو بہت تقویت پہنچی تھی اور انہیں محسوس ہوا کہ حالات کے پیش نظر وقت سے پہلے سُبا سمجھدار ہوگئی ہے۔

اور اس روز سے سکندر جان نے جوہی کو بھلے ہی جدید انداز میں نکھرتے دیکھا لیکن بہت کہنے کے باوجود سُبا اپنے مخصوص انداز میں جیتی رہی۔ دونوں نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے پاپا کو سب سے بڑی ذمہ داری کا احساس دلایا۔ سُبا کے لئے لڑکا تلاش کیا جانے لگا۔ لوگ اگر گھر میں سُبا کو دیکھنے کے لئے آتے تو ان کی زیادہ توجہ جوہی کی طرف ہوتی۔ یہ سکندر جان کے لئے عجیب سا مسئلہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ جوہی بظاہر بہت خوب صورت تھی بلکہ بہت پرکشش تھی۔ لیکن سُبا بہت سیریس رہنے کی وجہ سے اپنی عمر سے بہت آگے نکل گئی تھی۔

بہت کوششوں کے بعد سکندر جان کے دفتر کے ہی ایک پرانے دوست کے اکلوتے بیٹے انور سے جو کلکتہ کی ایک مشہور فرم میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھا۔ کچھ لین دین کے بعد سُبا کا رشتہ طے ہوگیا۔ انور میاں اکیلے رہتے تھے، اس لئے شادی کے بعد وہ سُبا کو جلد ہی کلکتہ لے کر چلے گئے۔

سُبا کے جانے کے بعد ایک عجیب سا گہرا سناٹا چھا گیا۔ جوہی تو فلموں، کیسٹوں اور دوستوں سے اپنا دل بہلالیا کرتی تھی لیکن سکندر جان......

پرانی نوکرانی اب گھر کا کام کاج کرنے کے قابل نہیں تھی۔ وہ اکثر اپنے گاؤں جانا چاہتی لیکن سکندر جان نے اسے روکے رکھا تھا کہ وہ جوہی کی شادی کے بعد چلی جائے گی، لیکن اس کی شکایت تھی کہ جوہی بھی اس کی کوئی بات نہیں مانتی ہیں۔ اسی بیچ اگر سُبا انور کے ساتھ گھر آجاتی تو ایسا لگتا کہ جیسے برسوں کی کھوئی ہوئی خوشیاں گھر لوٹ آئی ہوں۔ جوہی بھی بہت خوش ہوجاتی۔ انور اسے بہت عزیز رکھتے بلکہ جہاں کہیں سُبا کے ساتھ جایا کرتے تھے اسے ضرور ساتھ رکھتے۔

ایک بار سُبا آئی اور یہ کہہ کر جوہی کو لے گئی کہ میں کلکتہ میں ایم اے میں اس کا داخلہ کروارہی ہوں۔ وہاں ہم اکیلے رہتے ہیں انور اتنے مصروف ہیں کہ بس تھکے ہارے رات میں لوٹتے ہیں اور پھر سوجاتے ہیں۔ جوہی میرے ساتھ رہے گی تو میرا جی بھی بہل جائے گا اور مجھے

کمپنی بھی ملے گی۔ پہلے تو سکندر جان نے سوچا کہ داماد کے گھر بھیج کر وہ ان پر بوجھ کیوں ڈال دیں۔ لیکن سُبا نے یہ ضد کی تو وہ اس شرط کے ساتھ تیار ہوئے تھے کہ جوہی کے لئے ہر ماہ وہ تین ہزار روپئے بھیجا کریں گے...... سُبا نے یہ شرط مان لی تھی۔

جوہی کلکتہ میں سُبا کے ساتھ رہنے لگی سکندر جان ہر ماہ اسے روپے بھیج دیا کرتے۔ کبھی کبھی وہ ان سے ملنے خود آجایا کرتی، لیکن داماد کا گھر ہونے کی وجہ سے سکندر جان کم ہی جایا کرتے۔

انور جوہی کا بہت خیال رکھتے۔ اکثر دفتر سے کچھ پہلے ہی لوٹ کر آجاتے اور اسے تفریح کے لئے باہر لے جاتے۔ شروع شروع میں سُبا کو بھی ساتھ چلنے کے لئے کہتے، لیکن وہ کام کے بوجھ کی وجہ سے نہیں بھی جا پاتی۔ جوہی بہت خوش رہنے لگی تھی۔ اب اکثر دونوں تفریح کے بعد رات گئے گھر لوٹا کرتے۔ سُبا جب انہیں کھانے کے لئے کہتی تو دونوں بہت تھوڑا سا کھانا لے کر اٹھ جاتے۔ انور کو یہ شکایت ہونے لگی تھی کہ اب کھانے میں کوئی ذائقہ نہیں رہ گیا ہے جب کہ سُبا اپنی تمام تر کوششوں کے ساتھ لذیذ ترین کھانا بنانے میں لگی رہتی۔

انور میں اس نے زبردست تبدیلیاں محسوس کیں۔ بہت زور دے کر جوہی کو کلکتہ بلوانے کا مقصد اسے سمجھ میں آنے لگا۔ ہر چھوٹے بڑے کام کے لئے وہ جوہی کو ہی آواز دیتے تو سُبا کو عجیب سا محسوس ہوتا۔ وہ سوچنے لگتی کہ آخر ایسا کیا کچھ ہوگیا ہے کہ انور اس حد تک مجھ سے الگ رہنا چاہتے ہیں۔ پھر بھی سبا نے ان پر کبھی کچھ بھی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ کس حد تک اپنے احساس کی زمین میں تیزی سے دھنسنے لگی ہے۔ کبھی اس نے یہ بھی سن لیا تھا کہ جوہی نے انور کو جوتا پہناتے ہوئے کہا تھا کہ 'جیجا مہودے یہ سب کام آپ اپنی اردھانگنی سے کروائیے'۔

تو بہت شوخ انداز میں اسے بھینچتے ہوئے انور نے کہا تھا 'وہ اگر اردھانگنی ہے تو تم بھی میرے لئے آدھی گھر والی ہو......'

اب سُبا ایک ایسا بوجھ لے کر جی رہی تھی جسے وہ آسانی سے خود سے الگ نہیں کرسکتی تھی، لیکن اس بوجھ تلے اس کا اپنا وجود ہر لمحہ دفن ہوتا جارہا تھا۔ ایک روز اس نے یہ سوچا کہ کیوں نہ کسی طرح وہ یہ ساری باتیں پاپا سے کہہ دے۔ لیکن پھر سوچنے لگی کہ اس طرح ایک

ساتھ تین زندگیاں ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے اور یوں بھی وہ پاپا کو کوئی دکھ دینا نہیں چاہتی۔ انہوں نے تمام زندگی ہمارے لئے وقف کردی کہ اگر وہ چاہتے تو اپنے سکھ کے لئے ماں کے گزر جانے کے بعد کسی اور عورت کو بھی گھر میں لاسکتے تھے۔ سُبا ایک طرح سے ان کا آئیڈیل تھی شاید اسی لئے اس نے اس معاملے کو پاپا تک نہیں پہنچنے دیا۔

آج بھی بہت رات گئے جوہی اور انور گھر نہیں لوٹے تھے۔ سُبا سر کے درد سے پریشان تھی۔ گھر میں نیند کی چند گولیاں تھیں جن کا استعمال اب وہ ہر رات کیا کرتی۔ لیکن انور اور جوہی کے گھر لوٹنے کے بعد آج جب وہ سر کے درد سے بہت پریشان ہوگئی تو اس نے نیند کی دو گولیاں لیں اور بستر پر جا کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے نیند آگئی۔

اور جب اس نے آنکھیں کھولیں تو خود کو فرش پر پایا۔ انور زور زور سے چلا رہے تھے 'منحوس...... تم نے دروازہ کیوں نہیں کھولا۔ تو مجھے پڑوسیوں کے سامنے بدنام کرنا چاہتی ہے۔ ہمیں مجبوراً دروازہ توڑنا پڑا۔'

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی انور نے بہت بری طرح اسے پیٹا۔ جوہی نے کسی طرح دونوں کو الگ کیا اور پھر وہ بہلا کر انور کو دوسرے کمرے میں لے گئی۔ سُبا تمام رات درد سے کراہتی رہی۔

صبح جوہی سُبا کے لئے چائے لے کر آئی تو سُبا نے چاہا کہ وہ اپنے تمام آنسوؤں کو بہہ جانے دے لیکن اس نے روایت برقرار رکھی۔ جوہی نے اپنے آپ کو چھپاتے ہوئے اسے بہت سمجھایا اور پھر یونی ورسٹی چلی گئی۔ کچھ دیر بعد ناشتہ کئے بغیر انور بھی دفتر چلے گئے۔ بہت کوششوں کے بعد سُبا اٹھی اور پھر دھیرے دھیرے اس نے گھر کی صفائی کی۔ چولہے کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ ایک بجے دفتر سے انور کے لئے لنچ لینے کو چپراسی آیا کرتا تھا۔ یہی سوچ کر وہ کھانا تیار کرنے لگی لیکن بار بار اس کا ذہن کہیں اور چلا جاتا۔ انور اور جوہی کے مستحکم رشتے کی اب وہ ایک موہوم سی دیوار بن کر رہ گئی تھی۔ اندر سب کچھ کھوکھلا سا ہو گیا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ کس سے

کیا کہوں؟ سبھی اس کے اپنے ہیں۔اور اسی بیچ کب آگ نے اس کے دامن کو تھام لیا اسے پتہ بھی نہیں چلا۔ دیر تک وہ چولہے کی آگ سے جلتی رہی۔ تپتی رہی سونے کی طرح...... اور جب وہ اردھانگنی سے اردھ اگنی میں تبدیل ہوگئی تو پڑوسیوں نے اسے کسی طرح اسپتال پہنچادیا۔ کئی دنوں تک وہ بستر پر رہی۔ جب اس کا زخم صاف کیا جاتا تب بھی وہ بت بنی رہتی۔ گھر کے سبھی افراد اس کے آس پاس ہی رہتے، لیکن وہ کسی سے کچھ نہیں بولتی۔ کبھی کبھی انور اور جوہی کو مسکرا کر ضرور دیکھ لیتی اور انہیں اپنے چہرے کے تاثرات سے یقین دلاتی کہ کسی کو کچھ نہیں ہوگا۔ سب کچھ نارمل ہوجائے گا۔ لیکن جب وہ اپنے پاپا کے افسردہ چہرے کو دیکھتی تو اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے انہیں قریب بلاتی۔ بہت مضبوط ارادے کے ساتھ انہیں تقویت پہنچانے کی کوشش کرتی، لیکن پاپا کی آنکھوں میں آنسو تھمتے ہی نہیں تھے۔

کئی روز تک یہی سلسلہ قائم رہا۔ ایسا لگا کہ دھیرے دھیرے سچ مچ سب کچھ نارمل ہوجائے گا۔ ہر روز سُبا کی حالت میں کچھ سدھار ہونے لگا۔ وہ اپنے پاپا کو یقین دلانا چاہتی تھی کہ آگ کے دریا سے گزر کر بھی وہ اپنے مستحکم ارادے کے ساتھ زندہ رہنے کی کوشش کررہی ہے۔

ایک روز صبح کو اس کا زخم صاف کیا جارہا تھا تو پاپا کی آنکھوں نے بہت قریب سے اسے جاکر دیکھا اور وہ ایک دم کانپ اٹھے۔ اتنے سارے زخموں کے باوجود کسی کا زندہ رہنا کسی معجزے سے کم نہیں...... ! آخر سُبا تم روتی کیوں نہیں ہو میری بچّی؟ ...... میری پیاری بچّی تم بہہ جانے دو اپنے آنسوؤں کو...... لیکن سُبا نے کچھ بھی نہیں سنا۔ وہ دھیرے دھیرے دھند میں کھونے لگی۔ یہاں تک کہ ہمیشہ کے لئے نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

سب کچھ ختم ہوجانے کے بعد بھی اکثر نیند میں سکندر جان اپنی چھ سال کی ننھی منی سُبا کو کہانی سنارہے ہوتے ہیں لیکن سونے کی طرح آگ میں تپنے والی بات پر زور سے چونک جاتے ہیں اور پھر تمام رات سو نہیں پاتے۔ ■

چُھو بابا

سچ ہے کتنی برساتوں کے بعد بھی خون کے دھبے دھلے نہیں ہیں۔ اب تو یوں بھی آنکھوں کے برسنے کا یہ موسم کبھی ختم نہیں ہوگا۔ خدا کی یہ بستی لہو رنگ ہو چلی ہے...... شاید آپ اس شہر میں نئے آئے ہیں۔ اس لئے شاہراہ پر چمکتے ہوئے خون کے دھبے کو بہتوں کی طرح صرف اپنی راہ گذر سمجھ کر آگے نکل جاتے ہیں۔ لیکن میں ایسا نہیں کر پاتا جس روز بہت تیز بارش ہوتی ہے تو موسم کے ذرا تھمنے پر میں بہت خوش ہو کر اس راہ گذر کو یہ امید لئے ہوئے دیکھنے لگتا ہوں کہ شاید اب کے برس اس تیز بارش میں خون کے دھبے کا نام و نشان مٹ چکا ہوگا۔ لیکن ایسا کہاں ہوتا ہے؟ بادلوں کے ہٹنے پر دھوپ کی تھوڑی سی تمازت سے یہ دھبہ پہلے سے زیادہ چمکنے لگتا ہے۔

برسوں پہلے شہر کی اسی راہ گذر کے اطراف ایک شخص ہوا کرتا تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے اس شہر پر حاوی ہو گیا تھا۔ بڑھی ہوئی داڑھی، بالکل بکھرے ہوئے بال، آنکھوں میں بلا کی چمک، پچاس سے تجاوز کرتی ہوئی عمر۔ تن پر لباس مگر بے ترتیب۔ شانے پر ایک لمبا انگوچھا جسے اکثر سر پر بھی باندھ لیا کرتے۔ چاہے کوئی موسم ہو ننگے پاؤں ہی گھومتے نظر آتے۔ رات کے پچھلے پہر سنسان سڑک پر کچھ آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ دیتے۔ بغور دیکھنے پر ان لکیروں سے کوئی شبیہ ضرور ابھرتی۔ انہیں کبھی مندر کی سیڑھیوں پر سوتے ہوئے دیکھا جاتا، کبھی خانقاہ کے احاطے میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے نظر آتے۔ شروع شروع میں کئی دنوں تک غائب بھی ہو جاتے اور جب لوگ

انہیں بہت ڈھونڈنے لگتے تو ایک بار پھر نمودار ہوجاتے۔ کبھی کسی سے کچھ مانگتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ گفتگو بھی بہت کم ہی کیا کرتے۔ عموماً کسی پریشان حال انسان کو اشارے سے بلا کر اپنے ہاتھوں سے چھو دیتے اور پھر زیر لب کچھ بڑبڑاتے۔ وہ پریشان حال شخص کئی دنوں بعد انہیں تلاش کرنے میں کامیاب ہوتا اور بہت عقیدت کے ساتھ اعتراف کرتا کہ آپ کے آشیرواد سے میرا برسوں کا رکا ہوا کام بن گیا ہے۔ میں جو ایک دم ناامید ہوگیا تھا آپ کی دعاؤں سے کامیاب ہوگیا ہوں۔ اب وہ شخص کئی دنوں تک ان کے لئے زبردستی کچھ نہ کچھ لے کر پہنچتا رہا۔ یہ بات دھیرے دھیرے پھیلنے لگی کہ وہ جسے چھو کر آشیرواد دے دیتے ہیں، وہ شخص اپنے مشن میں ضرور کامیاب ہوجاتا ہے۔ اس کی تصدیق کچھ اس طرح بھی ہوتی رہی کہ چاہے کسی کے مقدمہ کا معاملہ ہو، امتحان میں کامیابی کا معاملہ ہو یا کسی کی نوکری ہی کیوں نہ ہو۔ اگر انہوں نے چھو دیا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اسی عقیدت کی وجہ سے شہر انہیں چھو بابا کے نام سے جاننے لگا۔ وہ مندر کی سیڑھیوں پر ہوں، خانقاہ کے برآمدے میں یا کسی چائے کی دوکان پر۔ لوگ انہیں تلاش کرتے ہوئے ضرور پہنچ جاتے۔

کبھی کبھی بابا کو ایسا لگتا کہ سارا شہر ہی بہت پریشان ہے۔ ہر شخص کی اپنی الجھنیں ہیں۔ اپنی پیچیدگیاں ہیں۔ لیکن بابا تو سب کے دکھوں کا مداوا کرنے میں معاون نہیں ہو سکتے تھے۔ کوشش تو ہر شخص کی ہوتی کہ کاش! بابا ایک بار چھو دیں تو کام بن جائے۔ لیکن وہ سبھوں کو چھو بھی نہیں سکتے۔ اس میں ان کے موڈ کا بہت بڑا دخل تھا اور کبھی کبھی تو ایسا ہوا کہ لوگ پریشانیوں کے ساتھ ان کے آس پاس رہے ہوں لیکن انہوں نے کسی کو بھول کر بھی نہ چھوا ہو اور ایسا بھی ہوا کہ کوئی شخص جو پہلی بار ان کے پاس آیا یا پاس سے گزرا تو انہوں نے چھو کر دعائیں دیں اور اس شخص کو کامیابی مل گئی۔ اب جو کبھی کبھی بابا بھیڑ سے گھبرا جاتے تو کہیں روپوش ہوجاتے لیکن جب انہیں محسوس ہوتا کہ شاید کسی کو ان کی بہت ضرورت ہے تو وہ اکثر رات گئے ضرورت مند

کے دروازے پر دستک دیتے۔ ضرورت مند انہیں دیکھ کر کِھل اٹھتا۔ اب تو بابا کی خوب آؤ بھگت ہوتی۔ انہیں ٹھہرنے کو کہا جاتا لیکن وہ کہیں ٹھہرتے بھی نہیں، بس اپنا کام کیا اور رات کے اندھیرے میں کہیں گم ہو گئے۔

اب بابا کو لے کر شہر میں دو حلقہ سرگرم ہوا۔ ایک وہ جو انہیں صوفی سنت مانتے ہوئے بے پناہ عقیدت رکھتا تھا اور دوسرا وہ جو انہیں ڈھونگی اور غیر ملکی جاسوس سمجھتا تھا۔ بابا کے چھونے سے جو حلقہ کامیابی کی بلندیوں کو چھو رہا تھا۔ اس نے ان کے لئے بہت اہم ترین یوجنائیں تیار کروالیں کہ چھو بابا کے لئے ایک آشرم بنایا جائے گا۔ لوگ اپنی زمینیں دان کریں گے۔ ہر وقت قوالی، کیرتن، بھجن، نعت، شبد سے ماحول گونجتا رہے گا۔ دوسرا حلقہ جس کی بے پناہ کوششوں کے بعد بھی بابا کا آشیرواد نہیں مل سکا تھا۔ اس گروپ کے بارسوخ لوگوں نے انہیں غیر ملکی جاسوس کہہ کر مقامی پولس اسٹیشن میں قید کروادیا۔ بہت پوچھ تاچھ کے بعد جب پولس کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ پاتی تو انہیں رہا کر دیتی۔ بابا کو لے کر اکثر دو فرقوں میں تنازعہ پھیلانے کی کوشش کی جاتی لیکن جب ان کی کسی خاص مسلک سے وابستگی ثابت نہیں ہو پاتی تو معاملہ بظاہر دب سا جاتا۔

کبھی کبھی ایسی الجھنوں سے پریشان ہو کر وہ پاس والے جنگل میں جا کر مہینوں گذار دیتے۔ لیکن ضرورت مند لوگ وہاں بھی پہنچ جاتے اور پھر کسی طرح انہیں شہر میں لایا جاتا اور فوری طور پر خوش کرنے کے لئے مندروں میں بھجن اور خانقاہوں میں قوالیاں ہوتیں۔ اس کے بعد کیا تھا، سبھوں کے چھو بابا یہ سن کر وجد میں آجاتے کہ ع

عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

اس ماحول کا ان پر کئی دنوں تک بہت اثر رہا۔ کسی سے کچھ بولتے نہیں۔ خود ہی گنگناتے رہتے۔ بہت جی چاہا تو آنکھ بند کئے ہوئے ہی کسی کو چھو کر آشیرواد دے دیا۔ آشیرواد پانے والا شخص فرط جذبات سے اپنی کامیابیوں پر خوش ہوتا ہوا اپنی منزل کی تلاش میں آگے بڑھ گیا۔

ایک روز بابا اسی کیفیت میں مبتلا تھے کہ اچانک بھاگ دوڑ شروع ہوگئی۔ چھو بابا کے عقیدت مند بھی وہاں سے سرکنے لگے۔ پتہ چلا کہ شہر کے سیاسی رہنما پرم آدرنیے نیتا جی چھو بابا سے ملنے آرہے ہیں۔ ان کے ساتھ سیکڑوں قتل میں ملوث بدنام زمانہ چنگو مہاجن بھی ہے۔ آج صبح سے ہی بابا آنکھیں بند کئے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی پلکوں سے کوئی موتی ابھرتے ہوئے ضرور دیکھا گیا تھا۔

ہوا یوں تھا کہ گذشتہ پندرہ برسوں میں ایک بار بھی نیتا جی الیکشن نہیں جیت پائے تھے۔ لگا تار ہار کی وجہ سے ان کی ساکھ لگ بھگ ختم سی ہوگئی تھی۔ اس بار وہ پرچۂ نامزدگی داخل کرنے سے پہلے کسی بھی حال میں چھو بابا کا آشیرواد لینا چاہتا تھا۔ چاہے کچھ بھی ہوجائے اس الیکشن کو انہیں جیتنا ہی تھا۔ بابا کے پاس پہنچ کر چنگو مہاجن زور سے زمین پر ڈنڈا پٹختے ہوئے بولا......

'ارے بابا...... ای دیکھئے آپ کے پاس کھود چل کر کون آیا ہے؟ ارے آنکھ کھولئے۔ دیکھے جرا...... نیتا جی نامی نیسن بھرنے جارہے ہیں۔ چاہے کچھ بھی ہو، جیتنا تو ان ہی کو ہے! اسیرواد دے دیجیے......'

بابا پھر بھی آنکھیں بند کئے رہے۔ چنگو مہاجن زور سے چلایا۔

'ہے بابا...... ارے سنتے نہیں ہیں کا...... اسیرواد دے دیجیے۔ اسیرواد......'

پھر نیتا جی خود بولنے لگے۔ 'بابا آپ کا آشیرواد بہت ضروری ہے۔ آپ بہت لوگوں کا بھلا کئے ہیں۔ میرا بھی بھلا کردیجئے۔'

تب ہی بیچ میں چنگو مہاجن ٹپک پڑا۔ 'ہے بابا...... بہرے ہیں کا۔ آنکھ کھول کر نیتا جی کو اسیرواد دیجیے گا کہ نہیں؟'

بہت کوششوں کے بعد جب بابا نے آنکھیں نہیں کھولیں اور نہ ہی انہیں چھو کر آشیرواد

دیا تو نیتا جی ایک دم برہم ہو گئے۔ بلکہ چنگو مہاجن کی آنکھوں میں تو خون ہی اتر آیا۔ وہ اسی وقت بابا کو ڈھیر کر دینا چاہ رہا تھا لیکن بات بگڑ جانے کی وجہ سے نیتا جی نے ہی منع کر دیا اور بہت بوجھل قدموں کے ساتھ بنا آشیرواد کے ہی انہیں لوٹنا پڑا۔

پرچۂ نامزدگی تو انہوں نے داخل کیا۔ لیکن بہت کوششوں کے باوجود الیکشن ہار گئے۔ اس شکست کے بعد وہ عوام سے زیادہ چھو بابا سے برہم ہو گئے۔ بار بار سبھوں کو یہی کہتے ملے کہ سالا ای چھو بابا بہت بڑا سنت فقیر سمجھتا ہے اپنے آپ کو؟

اس الیکشن میں ہارنے کے بعد نیتا جی ایک دم ٹوٹ گئے۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے کہ اس بار ایک معمولی آدمی نے انہیں بری طرح ہرا دیا تھا۔ حالانکہ اس معمولی آدمی کو بھی بابا نے آشیرواد نہیں دیا تھا۔ وہ اس دربار سے اسی طرح برہم لوٹا تھا۔

پھر بھی اکثریت یہی تھی کہ مٹی کو چھونے پر سونا بن جانے کی آستھا کے ساتھ چھو بابا کے آشیرواد کو جوڑ دیا گیا تھا۔ اندرونی سطح پر ان کا مخالف گروپ بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا تھا کہ اب تک کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے کسی کو چھو کر آشیرواد دیا ہو اور وہ اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہوا ہو۔

فساد کے لئے تاریخ میں یاد کئے جانے والے اس شہر میں ایک بار پھر دنگا بھڑک اٹھا۔ حسب روایت لوگ گھروں کو چھوڑ کر محفوظ مقامات پر پہنچنے لگے۔ جگہ جگہ لاشیں ملنے لگیں۔ سب کچھ دسترس سے باہر ہو گیا تھا۔ مکینوں کے جلنے کا منظر ایک بار پھر دلدوز لگا۔ ایسے میں بابا نہ مندر کی سیڑھیوں پر نظر آ رہے تھے اور نہ ہی خانقاہ کی چہار دیواری کے اندر مقید تھے۔ وہ تو سڑک پہ بے چینی کے عالم میں بھٹک رہے تھے۔ بلکہ یوں کہئے کہ اپنی سطح پر اس بربریت کو روکنے کی کوشش میں ہر شخص سے مل رہے تھے۔ کرفیو کی خلاف ورزی کے الزام میں پولس نے انہیں کئی بار پکڑا پھر بعض افسران کی عقیدت کی وجہ سے انہیں چھوڑ بھی دیا گیا۔ جب دونوں فرقے کے

بہت سارے لوگوں کو محفوظ مقامات تک پہنچانے میں بھی انہوں نے اپنا بھر پور تعاون دیا تو جائے اماں مل جانے کے بعد لوگ انہیں مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ انہیں بھی مذہب کی عینک سے دیکھے جانے کی کوشش کی جانے لگی۔ صرف یہی ثابت ہوسکا کہ بابا نے اس فساد میں بہت سارے لوگوں کی جانیں بچالی تھیں...... بہت سی قربانیاں، معصوم بچوں، جوان عورتوں اور مردوں کے قتل کے بعد پھر ماحول کو معمول پر لایا جانے لگا۔ احتیاطًارات کا کرفیو بدستور جاری تھا۔

اسی دوران ایک روز رات کے گہرے سناٹے میں جب بارش بہت تیز تھی تو بابا شاہراہ پر کھڑے ہوکر اپنے لئے کسی مناسب راہ کی تلاش میں تھے کہ اسی وقت انہیں آگہی ہوئی کہ کوئی ان کے قتل کے مشن کے ساتھ کسی بھی راہ سے ابھر سکتا ہے۔ وہ پیچھے مڑے تو چنگو مہاجن سامنے سے آتا ہوا نظر آیا۔ اگر بابا چاہتے تو اندھیرے میں کہیں گم ہو سکتے تھے۔ لیکن ان پر ایسا کوئی حکم صادر نہیں ہوا۔ قریب آتے ہوئے چنگو مہاجن کو انہوں نے سر سے پاؤں تک بغور دیکھا۔ وہ غصے میں ایک دم کانپ رہا تھا۔ کسی دم کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ بس اپنی کھلی آنکھوں سے بابا اسے دیکھے جارہے تھے۔ تبھی آسمان کی بلندیوں کی طرف دیکھا تو الوداعی ساعتوں کو دور سے آتے ہوئے محسوس کیا۔ اور اس وقت یہ فیصلہ کیا کہ وہ چنگو مہاجن کو اس کے مشن میں کامیاب ہونے کے لئے چھوکر آشیرواد دیں گے۔ جب وہ ایک دم بابا کے قریب پہنچ گیا تو انہوں نے دیر تک اسے چھوتے ہوئے آشیرواد دیا۔ چنگو مہاجن نے چمکتے ہوئے خنجر کو اپنی آستین سے نکالا اور دیکھتے ہی دیکھتے بابا کا سارا جسم لہولہان کر دیا۔ بابا کے جسم سے بہتے ہوئے لہو کو دیکھ کر زندگی میں پہلی بار قاتل ایک دم کانپ گیا۔ اس نے خنجر کو زمین پر پھینک دیا اور پھر تیزی کے ساتھ نہ جانے کس اندھیرے میں گم ہوگیا۔

آج چھو بابا کی لاش کو اٹھے ہوئے برسوں گذر چکے ہیں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ کتنی برساتوں کے بعد بھی خون کے دھبے دھلے نہیں ہیں۔ ■

اظہارِ تشکر

انتظار حسین، پروفیسر وہاب اشرفی، ندا فاضلی، پروفیسر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر محمد کاظم، حسن وارث، شاہدہ وارثی، افروز اشرفی، نثار احمد فیضی، امتیاز عالم، شمشیر قمر، محمد معظم

Canvas Per Chehre

(Selected Stories)

by

Quasim Khursheed

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540
E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com